ABC CERTIFIED

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہار سُو

راولپنڈی

مدیر اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

سالنامہ

ABC CERTIFIED

ماہنامہ

چہار سو

راولپنڈی

جلد اول۔ شمارہ: ۱۲۔ جولائی: اگست: ۱۹۹۳ء

مجلس ادارت

مدیر اعلیٰ ---------- سید ضمیر جعفری

مدیر مسئول ---------- گلزار جاوید

مجلس مشاورت

ڈاکٹر اے۔ایچ۔ دانی —— حمیرا رحمٰن (نیویارک) —— ڈاکٹر افضل اقبال

قیمت

فی شمارہ	18 روپے
چھ شمارے	104 روپے
زر سالانہ	200 روپے

بیرون ملک (ہوائی ڈاک سے)

امریکہ۔ کینیڈا	40 ڈالر
برطانیہ	20 پونڈ
سعودی عرب	80 ریال
متحدہ عرب امارات	80 درہم
قطر	ایضاً
شارجہ	ایضاً

رابطہ: ۲۵۶۹-۲-گوالمنڈی راولپنڈی-۴۶۰۰۰ فون- ۵۳۰۵۶۹ FAX: 419840

ترتیب

اداریہ 5

قرطاسِ اعزاز 7

نعت ــــ احمد ندیم قاسمی 8

بائیوڈیٹا -------- 9

براہ راست ــــ گلزار جاوید 10

احمد ندیم قاسمی شخصیت اور فنِ نعت گوئی ــــ حافظ لدھیانوی 19

احمد ندیم قاسمی ایک عظیم شاعر ایک عظیم افسانہ نگار ---- سید احتشام حسین 24

احمد ندیم قاسمی ---- شریف کنجاہی 27

باہر کے رابطے اندر کے رشتے ــــ رحیم گل 30

ہمارے عہد کا تنہا حساب دان جمال ــــ محسن احسان 36

احمد ندیم قاسمی تیسری دنیا کا شاعر ــــ آفتاب اقبال شمیم 41

ندیم ــــ ایوب خاور 45

احمد ندیم قاسمی ادب کے منگلا ڈیم سے مینارِ پاکستان تک ------ سید ضمیر جعفری 46

منظوماتِ ندیم 54

مقالاتِ ندیم

افسانہ ایک لباس آدمی ــــ احمد ندیم قاسمی 62

اقبال بحیثیت شاعر ---- احمد ندیم قاسمی 65

اقبال کے ساتھ انصاف کیجئے ــــ احمد ندیم قاسمی 68

کلیدی خطبہ ادیب اور مملکت ---- احمد ندیم قاسمی 72

کلیدی خطبہ ادیب اور آزادی اظہار ــــ احمد ندیم قاسمی 76

اکیسویں صدی بیسویں ایک آزمائش ایک چیلنج ــــ احمد ندیم قاسمی 78

نکاسی کالم ــــ احمد ندیم قاسمی 81

کامیاب زندگی کا تصور ــــ احمد ندیم قاسمی 84

حرفِ تحسین ---- 86

موت کی وادی میں پہلی رات ــــ غلام علی بلبل 91

سفرنامہ

بحرِ اوقیانوس کے اس پار ــــ سید ضمیر جعفری 93

افسانہ

ستم آشنا ــــ گلزار جاوید 97

بساطِ بشاشت

آپ بھی مسکرایئے ------ عنایت علی خان 100

شاعری کا شوق ــــ ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی 101

روپ رمنے

بزمِ بتاں میں سخن آزردہ ــــ انوار شریف 104

ملاقات ــــ عطیہ افروز 107

اندھیرے سویرے 110

رس رابطے 111

الحمد اللہ چہارسو نے ایک سالہ سفر بہ حسن خوبی پورا کیا اس راہ میں کن کن دشواریوں اور دقتوں کا ہمیں سامنا رہا ان کا ذکر کرکے سالگرہ کی خوشی کو بے مزہ کرنا ہمیں منظور نہیں۔

——— قدم قدم پر آپ کی محبت سے حوصلہ افزائی اور رہنمائی ملتی رہی اور اسی سہارے سے ہم آج چہارسو کے سالنامے کا سنگ میل حضرت احمد ندیم قاسمی کی بلند پایہ شخصیت اور فکروفن کی چاندنی میں عبور کر رہے ہیں۔

قرطاس اعزاز

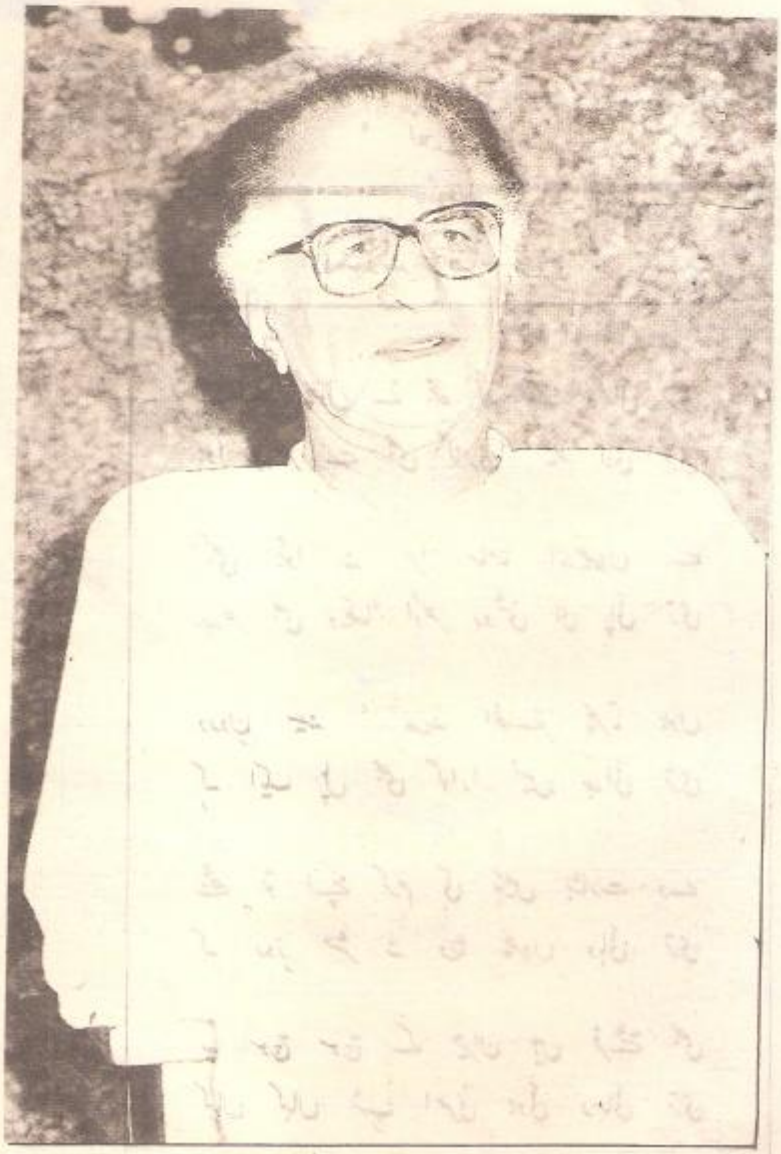

احمد ندیم قاسمی کے نام

نعت

احمد ندیم قاسمی

ہر ایک پھول نے مجھ کو جھلک دکھائی تری
ہوا جدھر سے بھی گزری، شمیم لائی تری

کبھی ہوا نہ مرا سامنا اندھیروں سے
جدھر بھی دیکھا، اُدھر روشنی ہی پائی تری

درونِ سینہ، مدینہ اٹھائے پھرتا ہوں
کہ ایک پل بھی گوارا نہیں جدائی تری

مجھے تو اپنے کرم کی یہیں بشارت دے
کہ روزِ حشر نہ دیتا پھروں دہائی تری

یہ سوچ سوچ کے حیران ہیں فرشتے بھی
کہاں کہاں شبِ اسریٰ ہوئی رسائی تری

ندیم کے سے کروڑوں کا ذکر کیا ہے، کہ جب
بڑے بڑوں کو بھی تسلیم ہے بڑائی تری

بائیو ڈیٹا

نام	احمد شاہ
ادبی نام	احمد ندیم قاسمی (اپنے پردادا محمد قاسم کی رعایت سے قاسمی)
تاریخ پیدائش	20 نومبر 1916ء
مقام	انگہ۔ تحصیل و ضلع خوشاب (پنجاب)
تعلیم	1935ء میں پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کی۔
ملازمتیں	(1) مترجم دارالاشاعت پنجاب' لاہور
	(2) سب انسپکٹر ایکسائز۔ ملتان
	(3) ایڈیٹر ہفت روزہ "پھول" اور ہفت روزہ "تہذیب نسواں" لاہور
	(4) ایڈیٹر ماہنامہ "ادب لطیف" لاہور
	(5) سکرپٹ رائٹر ریڈیو سٹیشن پشاور
	(6) ایڈیٹر رسالہ "سویرا" لاہور
	(7) ایڈیٹر رسالہ "نقوش" لاہور
	(8) ایڈیٹر روزنامہ "امروز" لاہور
	(9) ایڈیٹر رسالہ "فنون" لاہور
	(10) ایڈیٹر رسالہ "صحیفہ" لاہور
	(11) ناظم مجلس ترقی ادب۔ لاہور
	(12) اعزازی سیکرٹری "بزم اقبال" لاہور
	(13) ایڈیٹر رسالہ "اقبال" لاہور
1948ء --- 1949ء	جنرل سیکرٹری انجمن ترقی پسند مصنفین پنجاب
1949ء --- 1954ء	جنرل سیکرٹری انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان
نظر بندی (1)	مئی 1951ء --- نومبر 1951ء
(2)	اکتوبر 1958ء --- فروری 1959ء
غیر ممالک کے سفر	چین۔ انگلستان۔ سکاٹ لینڈ۔ جرمنی۔ ناروے۔ امریکہ۔ کینیڈا۔ بھارت
تصانیف شاعری	رم جھم۔ جلال و جمال۔ شعلہ گل۔ دشت وفا۔ محیط۔ دوام۔ لوح خاک
افسانے	چوپال۔ بگولے۔ طلوع و غروب۔ گرداب و سیلاب۔ آنچل۔ آبلے۔ آس پاس۔ در و دیوار۔ سناٹا۔ بازار حیات۔ برگ حنا۔ گھر سے گھر تک۔ کپاس کا پھول۔ نیلا پتھر
تنقید	تہذیب و فن۔ تعلیم اور ادب و فن کے رشتے
مرتبہ کتابیں	انگڑائیاں (معروف افسانہ نگاروں کا انتخاب)' نقوش لطیف (معروف خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب)' منٹو کے خطوط (ندیم کے نام)' نذر حمید احمد خاں (اہل علم و قلم کے منتخب مضامین)
پاکستان کے لوک گیت	(ترجمہ)
بچوں کے لئے	نئی نویلی کہانیاں' دوستوں کی کہانیاں' تین ناٹک

براہ راست ——— * ——— گلزار جاوید

کرۂ ارض کا درجہ حرارت روز بہ روز بڑھنے کا سبب سورج کا زمین سے فاصلہ کم ہونا بتایا جاتا ہے مگر ہم زمین پر بسنے والوں نے بھی خیر و شر حق و ناحق جائز و ناجائز حلال و حرام محبت اور نفرت کے بیچ کے فاصلہ کو بری طرح روند کر جس کی وہ کیفیت پیدا کر ڈالی ہے کہ دم گھٹنے اور سانس رکنے لگی ہے۔ اس کے باوجود دنیا قائم ہے خدا کا نور ہر روز روشنی اور حرارت جیسی نعمتوں سے اس دھرتی کو نوازتا ہے ـــــ قدرت کی اس فیاضی کا سبب اس کے وہ نیک بندے ہیں جو ہر طرح کی آسائشوں اور آلائشوں سے دامن بچا کر خود کو انسان اور انسانیت کے لیئے وقف کیئے ہوئے ہیں انھیں لوگوں کی محبت ریاضت اور لگن نے دھرتی کے حسن کو کسی قدر بچا کر رکھا ہوا ہے جناب احمد ندیم قاسمی کا شمار اردو ادب کے ایسے ہی گھنے سایہ دار جھکے درخت کا نام ہے جس کے فن کی چاندنی شبنم بن کر اس دھرتی کے حسن کو پامال ہونے سے بچانے میں ہمہ تن مصروف ہے آیئے ان کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے خدا کے حضور ان کی صحت سلامتی اور درازئ عمر کے لیئے دست بہ دعا ہو جائیں۔

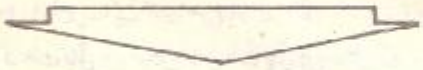

* خاندانی پس منظر اور تعلیمی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نئی باتیں بتائیے۔

* بزرگوں سے سنا ہے کہ اسلاف ممالک عربیہ سے ایران میں اور پھر افغانستان میں آکر آباد ہوئے۔ ہندوستان کے کسی مسلمان تاجدار کے دور میں وہ ہرات سے ملتان میں منتقل ہو گئے یہ حضرات دینی علوم پر حاوی تھے اس لئے کسی مسلم بادشاہ کے دور میں انھیں ملتان سے سون سکیسر بھیجا گیا کہ وہاں اسلام کی تبلیغ کریں۔ اس زمانے میں کوہستان نمک کی وادی سون میں بدھ آباد تھے۔ آج بھی ان بدھوں کی شکستہ یادگاریں پہاڑیوں کی چوٹیوں پر موجود ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وادی سون کے مغربی گوشے میں جو بہت وسیع و عریض جھیل پھیلی ہوئی ہے اسے بدھوں نے اپنے مذہبی رہنما مہاتما بدھ کے حوالے سے جو ساکی منی بھی کہلاتے تھے۔ "ساکی سر" (ساکی منی کی جھیل) کا نام دیا اور یہی نام سکیسر میں بدل گیا۔ سکیسر وادی سون کا بلند ترین پہاڑ ہے۔ آج کل یہ پاکستان ایئر فورس کا ایک اہم اڈا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ میرے اسلاف نے اسی جھیل کے شمال مشرقی کنارے پر ایک گاؤں آباد کیا جس کا نام "اسلام آباد" رکھا گیا۔ (آج کل یہ جھیل جھیل اوچھالی کہلاتی ہے کیونکہ اس کے ایک کنارے پر وادی سون کا مشہور قصبہ "اوچھالی" آباد ہے۔) اسلام آباد کی یہ بستی خوب پھولی پھلی جب ایران کا نادر شاہ ان سرزمینوں پر حملہ آور ہوا۔ اسلام آباد کے باشندے نادر شاہی لشکر کے قتل و غارت کے ڈر سے شمال کی پہاڑیوں میں پناہ گزین ہو گئے اور جب یہ خطرہ ٹل گیا تو انھوں نے واپس اسلام آباد آنے کے بجائے پہاڑ پر ہی ایک گاؤں "انگہ" آباد کیا تاکہ آئندہ کوئی حملہ آور اس طرف متوجہ ہو تو فوراً پچھلی پہاڑیوں میں منتقل ہو کر اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اسلام آباد کا گاؤں پھر کبھی آباد نہ ہو سکا۔ آج بھی چرواہے وہاں سے برتنوں، چنگیروں، کدالوں اور کلہاڑیوں وغیرہ کے آثار ڈھونڈ لاتے ہیں۔ وادی سون مدتوں تک ضلع شاہ پور کی تحصیل خوشاب کا حصہ رہی۔ پھر ایک نئے شہر سرگودھا میں یہ ضلع منتقل ہوا۔ تو ضلع سرگودھا کہلایا مگر اب خوشاب کو الگ ضلع کا درجہ دے دیا گیا ہے چنانچہ "انگہ" اس ضلع خوشاب کا ایک پہاڑی گاؤں ہے۔

میں چار برس کا ہوا تو انگہ کی اسی مسجد میں، جہاں حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی رحمتہ اللہ علیہ نے میرے خاندان کے بزرگوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، قرآن مجید کے درس میں شامل ہوا۔ دسویں گیارہویں سپارے تک پہنچا تھا تو میرے سرپرست چچا، پیر حیدر شاہ (مرحوم) نے یہ کہہ کر مجھے انگہ کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیا کہ پرائمری پاس کرنے کے بعد جب وہ مجھے اپنے پاس لے جائیں گے تو باقی قرآن مجید بھی پڑھا دیں گے۔ اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پرائمری کے فائنل امتحان میں وظیفہ حاصل کرنے کے بعد میں انھیں چچا کے ہاں کیمبل پور (حال اٹک) پہنچا جہاں وہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ میں نے وہیں دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی اور ایک چچا زاد بھائی کو قرآن مجید ترجمے بلکہ تفسیر کے ساتھ پڑھایا اور ساتھ ہی ادب کا ذوق بھی بیدار کیا۔ وہیں میں نے پروفیسر غلام ربانی عزیز اور ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم سے کسب فیض کیا۔

1930ء میں چچا جان کا تبادلہ شیخوپورہ ہو گیا۔ وہاں کے ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر جناب فضل الٰہی چشتی تھے جو آج کے دور کے ایک بڑے شاعر ن۔ م۔ راشد کے والد گرامی تھے۔ ان دنوں راشد لاہور میں زیر تعلیم تھے۔ جب کبھی وہ اپنے والد کے ہاں شیخوپورہ آتے تھے ہماری (دسویں) کلاس کو انگریزی کا سبق دینے سکول میں آنکلتے تھے۔ میں نے اپنی پہلی نظم (مولانا محمد علی جوہر کا نوحہ) شیخوپورہ ہی میں لکھی۔ پھر جب چچا جان کی ریٹائرمنٹ قریب آئی تو انھیں ریاست بہاولپور کے مشیر مال کے عہدے کی پیشکش کی گئی جو انھوں نے منظور کر لی اور اسی لئے انھوں نے مجھے میٹرک کے بعد صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں داخل کرا دیا۔ مگر حکومت نے ان کی ملازمت میں دو سال کی توسیع کر دی چنانچہ وہ وہیں رک گئے۔ البتہ 1934ء میں وہاں سے فارغ ہو کر بہاولپور تشریف لائے اور مشیر مال کا عہدہ سنبھالنے کے سلسلے میں نواب بہاولپور سے مل کر واپس انگہ میں سامان وغیرہ لینے پہنچے تو ان پر دل کا شدید دورہ پڑا اور وہیں انتقال فرما گئے۔ میں نے گریجویشن نہایت نا مساعد حالات میں کی اور اگر پروفیسر پیرزادہ عبدالرشید (مرحوم) میری مدد کو نہ آتے تو میری تعلیم کا سلسلہ رک جاتا۔ گریجویشن کے بعد اپنے دور کے فاضلِ اجل اور میرے خالہ زاد بھائی مولانا غلام مرشد (مرحوم) نے مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے انگریزی میں داخلہ دلانا چاہا مگر حالات کچھ ایسا کڑا رخ اختیار کر گئے کہ ایسا نہ ہو سکا اور میری تعلیم کا سلسلہ رک گیا۔ اس کے بعد میں حصول معاش کی تگ و دو میں مصروف ہو گیا۔

★ جیسا کہ ہمیں علم ہے، آپ کا تعلق مذہبی گھرانے سے ہے۔ وہ کون سے عوامل اور اثرات تھے کہ آپ نے دس گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا؟

* شعر کہنا ایک وہبی نعمت ہے جو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے میرا گھرانا غیر مذہبی یا آزاد خیال بھی ہوتا تو میں شعر کہنے لگتا کہ یہ میری شخصیت کا ایک ناگزیر جز تھا۔ پھر مذہبی ماحول کسی کو شاعری کرنے سے نہیں روک سکتا، شرط یہ ہے کہ مذہبی ماحول صحیح معنوں میں مذہبی ہو اور جس کی بنیاد توہم پرستی کے بجائے قرآن پاک اور آنحضورؐ کی تعلیمات پر ہو ------ اور قرآن یا حضورؐ نے کسی کو شاعری کرنے سے کب روکا ہے جبکہ حضرت حسان بن ثابت دربار نبوی ہی کے شاعر تھے اور جب قصیدہ کہتے تھے تو قدیم عربی شاعری کی روایات کے مطابق ابتدائی حصہ تشبیب پر صرف کرتے تھے اور حضورؐ اس پر کبھی معترض نہیں ہوئے۔

میرے اندر شاعر موجود تھا۔ اسے شہ اپنے سرپرست چچا کی علم دوستی سے ملی۔ ان کے ہاں اس دور کے سبھی بڑے ادبی رسالے آتے تھے اور میں آزادی سے ان کا مطالعہ کرتا تھا۔ پھر جب میں نے پہلی نظم کہی ------ یعنی مولانا محمد علی جوہر کا نوحہ لکھا تو میرے چچا جان نے مجھ سے بہت پیار کیا، میری پیٹھ ٹھونکی اور فرمایا کہ یہ نظم حیرت انگیز حد تک بحر و وزن اور قافیہ و ردیف کے حوالے سے درست ہے۔ وہ اتنے خوش ہوئے کہ خود لاہور جا کر اسے ایک روزنامے کے مدیر کے سپرد کر آئے جنہوں نے اس نوعے کو اخبار کے پورے صفحے پر بوقلموں رنگوں میں چھاپا۔ یوں میری ہمت افزائی ہوئی۔

★ ان شعرائے کرام کے اسمائے گرامی بتائیے جن سے آپ نے ابتدائی ایام میں اصلاح لی ہو، یا جن کی صحبت سے آپ کے فن میں پختگی آئی ہو۔

* میں نے باقاعدہ اصلاح کسی سے نہیں لی۔ بالکل ابتدا میں جب میں میٹرک کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، ایک بزرگ نے، جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے، مجھے خط لکھا کہ تم میں جوہر موجود ہے مگر یہ جوہر کسی استاد کی رہنمائی کے بغیر دب جائے گا۔ ان کا اسم گرامی مقبول انور داؤدی تھا اور وہ روزنامہ "سیاست" میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے نوجوان دوست حضرت شاطر غزنوی کا نام تجویز کیا جو غزل کہتے تھے، "سیاست" میں لکھتے تھے اور اندرون دہلی دروازہ لاہور، لنگی کلاہ کا کاروبار کرتے تھے۔ میں نے شاطر صاحب کو ایک غزل بھیجی۔ انہوں نے اسے تمام تر بدل دیا، اپنی طرف سے چند اشعار کا اضافہ بھی کر دیا اور اسے ایک رسالے میں چھپوا بھی دیا۔ مجھے یہ غزل یاد نہیں۔ ایک آدھ مصرع یاد ہے، مثلاً:

کہ مٹ جاتی ہیں موجیں، پاس جب جاتی ہیں ساحل کے

اور مقطعے کا دوسرا مصرع:

کہ ہم شاگرد بھی تو ہیں ندیم استادِ کامل کے!

مجھے یہ "مہربانی" متاثر نہ کر سکی اور میں نے انہیں کلام بھیجنا بند کر دیا۔ البتہ میں ان کے ایک احسان کو کبھی نہیں بھولوں گا کہ انہوں نے شروع ہی میں میرا تخلص "ندیم" تجویز کیا۔ اس زمانے میں ندیم نام عام نہیں تھا۔ صرف رسالہ "ادبی دنیا" کے منصور احمد مرحوم کبھی کبھار صرف ندیم کے نام سے اپنے رسالے میں اپنی ایک آدھ رباعی درج کر دیتے تھے۔ اب تو جدھر کا رخ کیجئے درجنوں ندیموں سے سابقہ پڑتا ہے مگر 30 - 1931ء میں صرف میں ہی ندیم تھا۔ یہ اس لفظ کا حسن ہے جو گزشتہ ساٹھ برس کے عرصے میں اس قدر مقبول ہوا ہے۔ یہ شاطر صاحب کا مجھ پر احسان ہے۔ بعد میں وہ فلمی کہانیاں، مکالمے اور گانے لکھنے لگے۔ جب بھی ان سے مڈبھیڑ ہوتی، میں ہمیشہ نہایت ادب سے ان سے ملتا اور ہمیشہ انکی تعظیم کرتا۔

انکے علاوہ اختر شیرانی تھے جو اس زمانے میں نوجوان طبقے کے محبوب ترین شاعر تھے حالانکہ وہ دور علامہ اقبال، اور جوش اور حفیظ کا دور تھا! میں بھی (برادر محترم سید ضمیر جعفری کی طرح) اختر کا مداح اور معتقد تھا، میں ان کے رسالہ "رومان" میں کلام بھیجتا تو وہ جہاں ایک آدھ مقام پر تبدیلی کرتے وہ میرے لئے نشان راہ بن جاتی۔ مثلاً میرا ایک نہایت ابتدائی شعر ہے:

تم نے اک روز کیا وعدۂ پرسش ہم سے
بس اسی روز سے آشفتہ و بیمار ہیں ہم

اختر صاحب نے "اک روز" کو "جس روز" میں بدل دیا اور شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

مجھ پر، میری شخصیت پر اور میری شاعری پر سب سے بھاری احسان گرامی قدر مولانا عبدالمجید سالک، مدیر روزنامہ "انقلاب"، لاہور نے کیا۔ وہ بھی اختر صاحب کی طرح ایک آدھ لفظ ادھر سے ادھر کر کے شعر کے معیار کو انتہائی بلندی پر لے جاتے تھے اور میں اس خاموش رہنمائی سے فیض یاب ہوتا رہتا تھا۔ اس دور میں حضرت حفیظ ہوشیار پوری اور میں روزنامہ "انقلاب" میں نہایت باقاعدگی سے لکھتے تھے چنانچہ حضرت سالک ہمیں "شعرائے انقلاب" کہا کرتے تھے۔ اگر میری زندگی میں وہ وارد نہ ہوتے تو میں یہاں وہاں ٹھوکریں کھاتا ہوا عملاً ختم ہو جاتا۔ میں جو کچھ بھی ہوں، انہی کی محبت اور حوصلہ افزائی کا ثمر ہوں۔

★ یہ بات تو طے ہے کہ آغاز آپ نے شاعری سے کیا۔ افسانہ لکھنے کی تحریک کب اور کیونکر ہوئی؟ کیا افسانے میں آپ کسی کو استاد مانتے ہیں؟ یا افسانے میں آپ کا آئیڈیل کون ہے؟

✱ یقیناً میں نے آغاز شاعری سے کیا۔ پھر جب میں صادق ایجرٹن کالج میں زیر تعلیم تھا تو آج کے نامور ادیب، طنز نگار اور سفرنامہ نویس جناب محمد خالد اختر سے میرے دوستانہ روابط استوار ہوئے۔ وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کے رکن تھے اس لئے ان کے ہاں کتابوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ وہ انگریزی فکشن کے عاشق تھے اور آر۔ ایل۔ سٹیونسن پر تو باقاعدہ فرفتہ تھے۔ انہوں نے سٹیونسن کے علاوہ متعدد انگریز اہل قلم کی کتابیں مجھے پڑھنے کو دیں اور ساتھ ساتھ اکساتے رہے کہ میں بھی کہانیاں لکھوں۔ یہ انہی کی عنایت ہے کہ میں نے افسانہ نگاری اختیار کی اور یوں اپنے تخلیقی جوہر کو ایک طرح سے غیر محدود کر دیا۔

میں افسانے میں کسی کو بھی استاد نہیں مانتا البتہ ابتدا میں منشی پریم چند نے مجھے متاثر کیا اور میں بعد میں چیخوف کا پرستار ہو گیا۔ افسانے میں اگر میرا کوئی آئیڈیل ہے تو وہ چیخوف ہے۔

★ آپ کا قلم ادب کی تمام اصناف پر حاوی ہے۔ آپ اپنی کون سی سائیڈ کو جینئس سمجھتے ہیں' یا یوں کہہ لیجئے کہ کس صنف میں تخلیق کرکے آپ کو لطف آتا ہے؟

✱ صرف شاعری اور افسانہ نگاری کی اصناف میری پسندیدہ اصناف ہیں۔ باقی جو کچھ بھی ہے' حصول معاش کا ذریعہ ہے۔ میں نے مزاحیہ کالم نویسی 35 برس تک کی ہے مگر ان بارہ ہزار کالموں میں سے دو تین سو کالم منتخب کرنے کے خیال ہی سے لرز جاتا ہوں جبکہ آج کل نوجوان ادھر چند روز کالم نویسی کرتے ہیں ادھر ان کے کالموں کا مجموعہ آجاتا ہے۔ اس طرح میری تنقید محض تاثراتی ہے۔ میں ایک تخلیق کار کے نقطۂ نظر سے ادبی مسائل پر تنقید کرتا ہوں اس لئے باقاعدہ نقاد نہیں ہوں۔

۔ شاعری میری محبوبہ ہے مگر افسانہ نگاری کو بھی کسی صورت میں کمتر نہیں سمجھتا چنانچہ دونوں کی تخلیق مجھے سرشار کر دیتی ہے۔

★ ملازمت کی ابتدا اور انتہا کے بارے میں تفصیل بتایئے۔

✱ ملازمت کا پہلا تجربہ نہایت تلخ تھا۔ میں ریفارمز کمشنر کے دفتر میں بطور "محرر" بھرتی ہوا۔ بیس روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔ دفتر گلاب سنگھ پریس کے قریب ایک تکون سی عمارت کی بالائی منزل میں تھا۔ افسر ایک پٹواری تھا جو پلنگ پر بیٹھتا تھا اور ہم محرر لوگ نیچے فرش پر بچھی ہوئی چٹائیوں پر ووٹروں کی فہرستوں کی چیکنگ کرتے تھے دن بھر فلاں ولد فلاں ذات سکنہ فلاں کی رٹ لگی رہتی تھی۔ ایک روز پٹواری نے مجھے حکم دیا کہ جاؤ پریس میں جا کر دوات میں روشنائی بھر لاؤ۔ میں نے عرض کیا کہ اس کام کے لئے چپراسی موجود ہے جو باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔ میں محرر ہوں۔ میں محرری ہی کا کام کروں گا ------- اور اس نے میری چھٹی کر دی۔

پھر میں نے چند دن دارالاشاعت پنجاب کے ہفت روزہ "تہذیب نسواں" کے لئے غیر ملکی کہانیوں کے تراجم کئے اور جو معاوضہ ملا اس سے گزر بسر کی۔ انہی دنوں ایک ہندو بزرگ کو حضور صلعم کی سیرت پر کتاب لکھنے کی سوجھی۔ وہ حضورؐ کا عقیدت مند تھا مگر چاہتا تھا کہ کتاب کوئی مسلمان لکھے جو ازدواج مطہرات کے سلسلے میں نہایت خوبصورت جواز پیش کرے۔ محترم سالک صاحب نے میرا نام تجویز کیا۔ معاوضہ پچہتر روپے مقرر ہوا۔ یہ بزرگ دیال سنگھ لائبریری کے ٹرسٹیز میں شامل تھے اس لئے لائبریرین سے کہا کہ اس لڑکے کو جس کتاب کی ضرورت ہو' فوراً نکال دو۔ یوں میں نے ان دنوں حضورؐ کی حیات طیبہ پر پچاس ساٹھ (بیشتر انگریزی کی) کتابیں پڑھ ڈالیں۔ پھر کتاب لکھی اور بزرگ کو پیش کر دی۔ وہ اتنے خوش ہوئے کہ مجھے پچہتر کی بجائے نوے روپے عنایت کر دیئے اور ظاہر ہے میری تو عید ہو گئی کیونکہ روپے کی موجودہ قیمت کے لحاظ سے وہ نوے روپے آج کے دو ہزار روپوں کے برابر ہوں گے۔

ٹیلی فون اپریٹرز کے امتحان میں کامیاب ہونے پر مجھے اوکاڑہ منڈی میں ٹیلی فون اپریٹر مقرر کر دیا گیا مگر میں اس ملازمت کو نو دن سے زیادہ برداشت نہ کر سکا اور بھاگ آیا۔ اس کے بعد محکمہ آبکاری میں سب انسپکٹر بھرتی ہو گیا۔ میرے پھوپھی زاد بھائی کیپٹن ملک امیر حیدر خان نے میرے لئے یہ اہتمام کیا۔ میں خانیوال اور ملتان میں بھنگ' چرس' افیون' چانڈو اور شراب کے کیس پکڑتا پھرا۔ ظاہر ہے یہ میرے ذوق کا ماحول نہیں تھا۔ محترم سالک صاحب کو لکھا۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ استعفیٰ دے کر لاہور بھاگ آؤ۔ بھائی جان (پیرزادہ محمد بخش) سے اجازت چاہی۔ انہوں نے بھی فوراً اجازت دے دی اور میں لاہور آ گیا۔ محترم سالک صاحب نے مجھے ہفت روزہ "تہذیب نسواں" اور ہفت روزہ "پھول" کی ادارت دلوا دی۔

میں اسی دوران میں رسالہ "ادب لطیف" کی ادارت بھی کرتا رہا۔ منٹو کی ایک کہانی اور مضمون چھاپنے پر میرے اور منٹو کے خلاف مقدمہ چلا مگر ہم دونوں بری ہو گئے اور ناشر سزایاب ہوئے۔ البتہ بعد میں وہ بھی بری قرار دے دیے گئے۔

نروس بریک ڈاؤن نے مجھے لاہور سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ میں انگہ آ گیا اور وہاں کی آب و ہوا امی مرحومہ کی توجہ سے آہستہ آہستہ صحت یاب ہونے لگا۔ اسی دوران میں سجاد سرور نیازی مرحوم نے' جو ان دنوں پشاور ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر تھے اور ان کے گھرانے سے ہمارے خاندانی تعلقات تھے' مجھے پشاور بلوا بھیجا۔ میں وہاں بحیثیت سکرپٹ رائٹر 1948ء کے آغاز تک کام کرتا رہا۔ وہیں پشاور کے دوستوں فارغ بخاری' رضا ہمدانی' خاطر غزنوی وغیرہ کے علاوہ نوجوان محسن احسان اور احمد فراز سے بھی ملاقات ہوئی اور ریڈیو سٹیشن کے ایک اہل کار اور نہایت عمدہ غزل گو حمید نسیم سے تعلق پیدا ہوا۔ پشاور میں قیام کے دوران میں چوہدری نذیر احمد کا نیا رسالہ "سویرا" بھی مرتب کرتا رہا۔ اس کے ابتدائی تین شمارے میرے مرتب کردہ ہیں۔

پھر جب میری منہ بولی بہنیں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور ترک وطن کر کے لکھنؤ سے لاہور آ گئیں تو میں ان کی سرپرستی کی خاطر پشاور سے مستعفی ہو کر لاہور آ گیا۔ یہاں ہاجرہ بہن نے اور میں نے محمد طفیل صاحب کے تعاون سے رسالہ "نقوش" کا اجراء کیا۔ 1949ء کے آخر تک یہ سلسلہ چلا مگر ہماری ترقی پسندانہ انتہا پسندی سے گھبرا کر ہمارے دوست محمد طفیل (مرحوم) نے ہمارے ساتھ چلنے سے معذرت کر لی۔ ظاہر ہے ہم تو خالی ہاتھ تھے۔ ان کے بغیر رسالہ چلانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا اس لئے "نقوش" ان کے سپرد کیا اور خود بیروزگاری کے صحرا میں داخل ہو گئے۔

اس دوران میں ادب کی ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی' البتہ انتہا پسندی کی طرف جا رہی تھی۔ میں انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا جنرل سیکرٹری تھا۔ ہم نے خوب جلسے کئے' خوب جلوس نکالے اور پھر 1951ء میں سنٹرل جیل لاہور کی ایک کوٹھڑی میں بند کر دئے گئے۔ رہائی کے کچھ عرصہ بعد مجھے روزنامہ "امروز" (لاہور) کی ادارت کی پیش کش ہوئی جو میں نے منظور کر لی۔ میں نے چھ برس تک اس روزنامے کی ادارت کی مگر 1958ء میں جب جنرل ایوب خان نے پاکستان پر قبضہ کر لیا تو مجھے پھر لاہور اور راولپنڈی کی جیلوں کے علاوہ لاہور کے شاہی قلعے میں بھی رہنا پڑا۔ فروری 1959ء میں رہا ہو کر آیا تو چند روز بعد ایوب خان کی حکومت نے میرے دوست قدرت اللہ شہاب مرحوم وغیرہ کے مشورے سے "امروز" اور "پاکستان ٹائمز" اور "لیل و نہار" پر قبضہ کر لیا اور میں "امروز" کی ادارت سے احتجاجاً الگ ہو گیا۔

تب میں نے ایک اشاعتی ادارہ "کتاب نما" چلانا چاہا مگر دماغ کا کاروباری خانہ خالی ہے اس لئے یہ ادارہ فلاپ ہو گیا۔ 1963ء میں رسالہ "فنون" کا اجراء کیا اور اسے اب تک چلا رہا ہوں۔ اب یہ رسالہ تیس برس کا ہو چکا ہے اور میں ان تیس برسوں پر نظر ڈالتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ میں کیسے مشاعروں اور کتابوں کی آمدن سے یہ رسالہ چلاتا رہا اور اب تک چلا رہا ہوں جبکہ میری ملکیت میں صرف ایک دو بیگھہ زمین ہے اور وہ بھی انگہ کی پہاڑیوں میں گھری ہوئی۔

1974ء میں جب محترم پروفیسر حمید احمد خان مرحوم کا انتقال ہوا تو مجلس ترقی ادب کی نظامت کی اسامی خالی ہوئی۔ ان دنوں جناب حنیف رامے پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اور میرے محبوب دوست پروفیسر فتح محمد ملک عارضی طور پر ان کے پریس ایڈوائزر تھے۔ انہوں نے اس اسامی کے لئے میرا نام تجویز کیا اور یوں میں اس نیک نام علمی و ادبی ادارے کا ناظم مقرر ہوا۔ ہر تین برس بعد ملازمت میں توسیع ہو جاتی ہے اس لئے میں 1974ء سے اب تک اس عہدے پر فائز ہوں میرے دور نظامت میں دو سو کے قریب کتابیں اس ادارے کی طرف سے اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ ساتھ ہی پروفیسر محمد عثمان مرحوم کے بعد بزم اقبال کے اعزازی سیکرٹری کا کام میرے سپرد کیا گیا اور میں نے یہ فرض دس بارہ برس تک نبھایا۔

★ ترقی پسندی کی اصلاح کب اور کیونکر رائج ہوئی۔ آپ کے رجحان کے اسباب کیا تھے؟

* 34 - 1935ء میں امیر گھرانوں کے چند نوجوانوں نے' جو انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہے تھے' انگریز کے استعمار' جرمنی اور اٹلی کے فاشزم' خود اپنے وطن میں ملائیت کی گرفت اور بڑے بڑے زمینداروں وڈیروں' خانوں' پیروں تمن داروں کے ہاتھوں کروڑوں عوام کے اندھا دھند استحصال کے خلاف ایک ثقافتی محاذ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1936ء میں اسی جذبے کے تحت پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن (انجمن ترقی پسند مصنفین) کا قیام عمل میں آیا جس کے ہمدردوں میں نیگور' منشی پریم چند اور مولوی عبدالحق کی سی شخصیات بھی شامل تھیں مگر اس سے بہت پہلے ہی سے میں غیر ملکی استعمار کی غلامی اور انسان کے ہاتھوں انسانوں کے استحصال سے شدید نفرت کرنے لگا تھا۔ انجمن کا رکن بننے سے بہت پہلے میں نے اپنے پہلے مجموعہ کلام "جلال و جمال" کا جو طویل دیباچہ لکھا ہے' وہ اس حقیقت کی شہادت دے گا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے بڑے زمینداروں کے مظالم' ملائیت کی گرفت' پیروں فقیروں کی زیادتیوں اور انگریزی حاکمیت کی سفاکی کے مناظر دیکھے تھے اس لئے میں مروجہ صورت حال سے انتہائی حد تک متنفر

تھا۔ یہی میری ترقی پسندی تھی۔

★ اکثر احباب آپ کے بارے میں تذبذب اور گومگو کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ آپ بیک وقت کٹر مذہبی اور پکے ترقی پسند ہونے کا دعویٰ کرتے رہے۔

* میں کٹر مذہبی تو کسی صورت میں نہیں ہوں۔ میں تو بڑا فراخ دل مسلمان ہوں اور ہر اس نیک آدمی کو سینے سے لگانے کو تیار ہوں جو چاہے کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا ہو مگر عملاً نیک ہو۔ "پکا" ترقی پسند یقیناً ہوں۔ میرا مذہب میری ترقی پسندی میں کسی طرف سے بھی مزاحم نہیں ہے' بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ خود اسلام بے حد ترقی پسند مذہب ہے جس نے گورے کالے' عربی عجمی' امیر غریب' بڑے چھوٹے' کی تفریق ہی سرے سے ختم کر ڈالی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کا مسلمان بیشتر محض برائے نام مسلمان ہے۔ میرا ایک شعر ہے:

یوں مسلماں تو بہت ہیں ' مگر اب تک نہ سنا
اک مسلماں سے بھی' اک پیروِ اسلام کا نام

ایک اور شعر ہے:

بھیک مانگے کوئی انسان تو میں تیغ اٹھتا ہوں
بس یہی خامی ہے مرے طرزِ مسلمانی میں

اس صورت میں میری مذہبیت اور میری ترقی پسندی کے ضمن میں احباب کا تذبذب اور گومگو میں مبتلا ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ترقی پسندی کے لئے کافری ضروری ہے؟ کیا ترقی پسند کہلوانے کے لئے کمونسٹ ہونا ضروری ہے؟ یقیناً نہیں۔ پھر یہ تذبذب چہ معنی دارد؟

★ غالباً جب آپ ترقی پسند تحریک کی سیکرٹری شپ کے عہدے پر فائز تھے تو کچھ ترقی پسند دوستوں کو آپ سے شکایات پیدا ہوئیں۔ وہ شکایات کیا تھیں؟ آپ کے ازالے سے ان دوستوں کی تشفی ہوئی کہ نہیں؟

* سجاد ظہیر نے' جو پاکستان کمونسٹ پارٹی کے سربراہ تھے اور "انڈر گراؤنڈ" تھے' اپنے پیغام رسان کے ہاتھ مجھے ایک طویل خط لکھا۔ مفہوم یہ تھا کہ کمونسٹ پارٹی کے ممبر ہو جایئے۔ میں نے اتنے ہی طویل خط میں عرض کیا کہ میں خدا کی وحدانیت اور اس کے رسول پاک کی نبوت پر ایمان رکھتا ہوں اس لئے میں کمونسٹ کیسے ہو سکتا ہوں۔ میں انجمن کے منشور کا پابند ہوں' کمونسٹ مینی فیسٹو کا نہیں۔ یہ دونوں خطوط ہماری خفیہ پولیس کی تحویل میں ہوں گے کیونکہ خانہ تلاشیوں کے دوران انہیں یہ "نعتیں" ملی تھیں۔ شاید میرا یہی انکار ان بیشتر ترقی پسند احباب کی شکایت کا سبب بنا جنہیں سوویٹ روس کی "تقدس" پر کامل ایمان تھا۔ پھر میں نعتیں تو قیام پاکستان سے پہلے سے لکھ رہا تھا مگر جب یہ نعتیں مقبول ہوئیں تو بعض احباب نے یہ تک کہنے سے گریز نہ کیا کہ جو شخص نعت لکھتا ہے وہ ترقی پسند کیسے ہو سکتا ہے (فیض صاحب نے امام حسین کا مرثیہ بھی لکھا ہے اور اچھا کیا جو لکھا ہے مگر فیض' فیض ہیں اور میں صرف ندیم ہوں)

میں نے اپنے ان احباب کی تشفی کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اس دوران میں جب بھی کسی طرف سے بھی ادب کے ترقی پسند نظریے پر حملہ ہوا' میں نے فوراً اس کا نوٹس لیا اور اپنے نظریے کی مدافعت کی جبکہ ترقی پسندی کے "بڑے" یہ کہتے رہے کہ ہم تو ان حملوں کا نوٹس نہ لے کر انہیں نظر انداز کرتے ہیں' جبکہ دراصل وہ خوفزدہ تھے کہ ندیم کی طرح کسی کو چھیڑ دیا تو پھر خیریت نہیں۔ اسی نکتے پر غور کر لیجئے کہ جماعت اسلامی کے اخبار مجھے آج بھی بخشنے کو تیار نہیں ہیں اور دائیں بازو کے بے شمار اہل قلم مجھے اپنا ذاتی دشمن سمجھنے لگتے ہیں۔ اخبارات کے صفحات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ محض میری ترقی پسندی کی وجہ سے یہ حضرات کہاں کہاں کی کوڑیاں لاتے ہیں۔

★ بہت سے لوگوں' بالخصوص آپ کے نظریات کے حامی لوگوں کو آپ کا شخصی حکومت سے ایوارڈ لینا ناگوار گزرا!

* یہ ایوارڈ کسی ایک شخص کی طرف سے نہیں ملتے' مملکت پاکستان کی طرف سے ملتے ہیں' اور مملکت پاکستان کی طرف سے ایوارڈ ملنا ایک بڑا اعزاز ہے۔ مشکل یہ ہے کہ قیام پاکستان کے دس گیارہ برس تو سیاست دان آپا دھاپی' دستور سازی' دستور شکنی وغیرہ میں مصروف رہے۔ اس کے بعد مارشل لاز کا وہ دور آتا ہے جس نے پاکستان کے تشخص کو تس نہس کر دیا۔ صرف ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے چند برس اور محترمہ بینظیر بھٹو کی حکومت کے چند سال محفوظ رہے ورنہ ملک پر فوجی آمری حکمران رہے۔ مجھے دو ایوارڈ ملے ہیں۔ پہلا پرائڈ آف پرفارمنس کا ایوارڈ تھا جو ایوب خان کے دور میں ملا مگر یقین کیجئے کہ میں اخبار دیکھ رہا تھا جب ایک ذیلی سرخی میں مجھے اپنا نام نظر آیا۔ ظاہر ہے یہ حکومت کی زیادتی تھی کہ جسے ایوارڈ دیا جا رہا ہے اس سے پوچھا ہی نہ جائے اور ایوارڈ اس کے سر پر تھوپ دیا جائے۔ مگر اس ایوارڈ کے ساتھ یہ وضاحت موجود تھی کہ یہ میری سالہا سال کی ادبی خدمات کے اعتراف میں دیا جا رہا ہے یہ ایوارڈ مجھے بذریعہ ڈاک بھجوا دیا گیا۔ دوسرا ایوارڈ "ستارہ امتیاز" کا ہے جو جنرل ضیاء الحق کے دور

میں اور وہ بھی میری ادبی خدمات کے صلے میں ملا۔ مجھ پر اس کا انکشاف بھی اس روز ہوا جس روز اس کی خبر اخباروں میں آئی۔ مجھ سے استفسار کا تکلف ہی نہیں برتا گیا۔ تاہم یہ بھی مملکت پاکستان کی طرف سے اعزاز تھا ---- میرے محترم فیض احمد فیض مرحوم کو پاکستان کے دشمن نمبر2 یعنی سوویٹ روس کی طرف سے لینن امن انعام ملا تو تہنیت کے دو ٹکڑے برسائے گئے مگر میرے "ستارہ امتیاز" کو گردن زدنی قرار دیا گیا کہ میں نے ایک "خون آلود ہاتھ والے" حاکم سے ہاتھ ملایا جبکہ میرے محترم دوست فیض نے اسی خون آلود ہاتھ والے حاکم سے ڈیڑھ دو گھنٹے کی طویل ملاقات کی اور ظاہر ہے کہ اس طویل ملاقات میں صرف موسم اور آب و ہوا کی باتیں نہیں ہوئی ہوں گی۔ حیرت ہے کہ صرف میں کیسے متہم گردانا گیا جبکہ:

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

میں نے ماہنامہ "ہیرلڈ" کو انٹرویو دیتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ ان جابروں کے حق میں لکھی ہوئی میری ایک سطر ---- میرا ایک لفظ ہی دکھا دیجئے۔ میں نے تو ضیاء الحق کے دور اقتدار ہی میں اس ماہنامے کو بتایا تھا کہ ضیاء الحق صاحب کا ریفرنڈم اعلیٰ پیمانے کے ایک فراڈ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور جو نوے دنوں کے لئے آئے تھے انہیں نوے مہینوں سے بھی کہیں زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ کیا کسی اور "مہا ترقی پسند" کو یہ کہنے کی توفیق ہوئی؟ پھر جب مملکت پاکستان پر آمر پہ آمر مسلط ہوتا چلا جائے تو کیا اس مملکت کے اعزازات کو زیر زمین دفن کر دینا چاہئے؟ ---- مشکل یہ ہے کہ مخصوص حکومتوں کے خاتمے کے بعد بھی جن اصحاب کو اس نوع کے ایوارڈ ملے ان میں سے بیشتر کی خدمات "ادبی" سے کہیں زیادہ کسی اور نوعیت کی ہیں۔ ساتھ ہی میں نے دو اہل قلم کانفرنسوں میں کلیدی خطبہ پڑھا اور دونوں خطبوں میں مارشل لاء حکومت کو کھری کھری سنائیں اور صاف کہا کہ ہم آپ کے وفادار نہیں ہیں، ہم اپنی مملکت کے اور اس کے کروڑوں عوام کے وفادار ہیں۔ کیا کسی اور کو برسرِ عام یہ کہنے کی توفیق ہوئی؟

★ قیام پاکستان کے بعد بڑی شد و مد سے دائیں اور بائیں نظریات کا ادب تخلیق ہوا۔ اس کے بیچ نیوٹرل لوگوں نے جو ادب تخلیق کیا اسے آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

* نیوٹرل نام کے ادب کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔ وہ دوست جو کہتے ہیں کہ ہم نیوٹرل ہیں اور ہمارا کوئی نظریہ نہیں ہے، دراصل اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ "بے نظریاتی پن" ہی ان کا نظریہ ہے۔ آخر لایعنیت اور بے معنویت بھی تو نظریات ہیں۔ چنانچہ یہ "نیوٹرل" والا ڈھکوسلا غلط ہے۔ البتہ میرا نظریہ یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ بائیں بازو کے اہل ادب کا سارا ادب معیاری ہو اور دائیں بازو کے اہل ادب کا تمام ادب غیر معیاری ہے۔ بعض بائیں بازو والے بھی گھٹیا چیزیں لکھتے ہیں اور بعض دائیں بازو والے بھی غیر فانی تخلیق پر قادر ہیں۔ نظریے کا معاملہ الگ ہے اور فن کی کسوٹی الگ۔

★ تقسیم ہند نے اردو ادب پر کس طرح کے اثرات مرتب کئے ہیں، یعنی اردو ادب اس صورت حال سے وسعت پذیر ہوا یا اسے زوال کا سامنا ہے؟

* تقسیم کے اثرات اردو ادب پر یقیناً مرتب ہوئے ہیں بلکہ جنوبی ایشیا کی تمام زبانوں کے ادب پر یہ اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ یہ اثرات اس لحاظ سے مثبت ہیں کہ مسلمان، ہندو اور سکھ ادیبوں نے فرقہ وارانہ فسادات کی شدید مذمت کی اور انسانیت کا پرچم سربلند کیا۔ بعض عناصر حتمی رجحانات کی زد میں بھی آئے مگر یہ کیفیت عارضی تھی۔ پاکستان میں تو اردو ادب بھرپور انداز میں وسعت پذیر اور ترقی پذیر رہا، البتہ ہندوستان میں وقتی طور پر اسے نقصان پہنچا مگر اب کیفیت یہ ہے کہ جتنا اردو میں تنقیدی اور تحقیقی کام ہندوستان میں ہو رہا ہے اس کا مقابلہ پاکستان بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو ادب مخدوش حالات میں بھی زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

★ ملا اور مسٹر کی بحث شدت اختیار کرتی جا رہی ہے حتیٰ کہ علامہ اقبال کو متنازعہ بنانے کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔ آپ ان دو انتہاؤں کے بیچ حد فاصل قائم کرنے کے لئے کیا تجاویز دیں گے؟

* خدا کا شکر ہے کہ ملا اور مسٹر کی بحث میں شدت پیدا ہو رہی ہے۔ اس طرح اس نازک مسئلے کے حل کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ "ملائیت" کا مطلب "اسلام" نہیں ہے اور "مسٹریت" کا مطلب اندھا دھند مغرب پرستی نہیں ہے۔ اس نکتے کو پوری طرح واضح ہونا چاہئے۔ یقیناً یہ دو انتہائیں ہیں مگر اس خلیج کو پاٹنا وسیع النظر علمائے دین اور برداشت کی قوت رکھنے والے جدید تعلیم یافتہ عناصر کا کام ہے جو دینیات کے علاوہ معاشیات، سائنس، ٹکنالوجی، فلسفہ اور فنون لطیفہ پر بھی حاوی ہوں۔ یہ دور سائنس اور دیگر جدید علوم کا ہے۔ توہمات اور غلط مذہبی روایات ان علوم کی ترقی اور وسعت میں مزاحم ہوتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ آج بھی بعض ملا حضرات انسان کے چاند پر اترنے کو جھوٹ قرار دیتے ہیں۔ انہیں اتنی تعلیم سے تو آراستہ ہونا چاہئے جو توہمات کو بے

منفی قرار دے ڈالے۔ اسی طرح جدید تعلیم یافتہ حضرات کو بھی اپنے اندر برداشت کی توانائی پیدا کرنی چاہیے اور مسائل پر الجھنے یا ایک دوسرے کو جاہل قرار دینے کی بجائے ایک دوسرے کے دلائل کا وزن محسوس کرنا چاہیے۔ علامہ اقبال تو اس ملائیت کے شدید دشمن ہیں جو "فی سبیل اللہ فساد" برپا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتی اور جس نے اسلامی تعلیمات کا چہرہ مسخ کر ڈالا ہے۔ اور ابھی کہاں ابھی تو علامہ کے لیکچرز کا عام فہم ترجمہ نہیں ہوا۔ ہو گیا تو دیکھیے گا ملا لوگ کیسے علامہ پر چڑھ دوڑتے ہیں، مگر آخر چاند کا تھوکا تو منہ پر ہی آتا ہے۔

★ ادب میں گروہ بندیوں کے رجحان کی ابتدا کب ہوئی، نیز ادب پر اس نے کس قسم کے اثرات مرتب کیے؟ ان گروہ بندیوں کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ ان کا قلع قمع کس طرح ممکن ہے؟

❋ گروہ بندیوں اور ادبی چپقلش کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا لفظ پرانا ہے مگر بیشتر چپقلش زبان و بیان تک محدود ہوتی تھیں اردو شعر و ادب میں ایک دور گالی گلوچ کا بھی آیا مگر یہ عارضی ثابت ہوا۔ اختلاف رائے تو پڑھے لکھے طبقے اور سوجھ بوجھ والے عناصر کے نزدیک ایک نعمت سے کم نہیں، لیکن جب ذاتیات بھی اس اختلاف کی زد میں آجائیں تو ادب کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی۔ گروہ بندیوں کے اثرات عموماً منفی ہوتے ہیں کیونکہ ادیب خود کو بعض پست تعصبات میں محدود کر لیتا ہے اور وسعت نظر سے دست کش ہو جاتا ہے۔ یہ پارٹی بازیاں ایک لعنت ہیں جو ذہنوں پر مسلط کر دی جاتی ہے۔ اس کا قلع قمع صرف اس طرح ممکن ہے کہ ثروت مند عناصر جو گروہ بندیوں کے بل پر شہرت حاصل کرتے ہیں اور اس شہرت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور اسی لئے اپنی تجوریوں کے دھانے کھول دیتے ہیں اپنی اس منفی سرگرمی سے باز آجائیں کیونکہ ان کی بقائے دوام کا ضامن تو ان کا تخلیقی لفظ ہے، اثر و رسوخ اور دولت و ثروت نہیں۔ بعض چھوٹے ذہن اسی پر گزر بسر کرنے کو ترجیح دینے لگتے ہیں اور یوں کیسا کیسا جوہر قابل دشنام و بہتان کے گرد و غبار میں دب جاتا ہے۔ قلع قمع صرف اس طرح ممکن ہے کہ جو افراد اس گندے کاروبار میں مبتلا ہیں، اس کمینہ ذہنیت سے علی الاعلان دست کش ہو جائیں اور منافقت ترک کر دیں اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

★ آج جو ادب ہم تخلیق کر رہے ہیں، معاشرے پر اس کے کس قسم کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ ہمارا ادب ہماری سمت کا تعین کر رہا ہے یا نہیں؟

❋ یقیناً کر رہا ہے۔ اعلیٰ معیار کی شاعری ہو رہی ہے۔ خوبصورت اور کامیاب افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ ہماری تنقید اور تحقیق ابھی تخلیقی ادب کے معیار تک نہیں اٹھ سکی ورنہ جس ادب میں پروفیسر فتح محمد ملک، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، مشفق خواجہ، رشید ملک، ڈاکٹر سلیم اختر، یوسف حسن، عارف عبدالمتین اور مرحومین میں سے ممتاز حسین، محمد حسن عسکری، سلیم احمد، مجنوں گورکھپوری اور اختر حسین رائے پوری کے سے نقاد اور محقق میسر ہوں یا رہے ہوں، اس سے مایوس ہونا کفر ہے۔ اس ادب کے اثرات مثبت ہیں۔ بعض منفی تحریکیں بھی ساتھ ساتھ چلتی ہیں مگر ان کی مثال رنگین غباروں کی سی ہوتی ہے۔ جو ایک وقفے کے بعد پھٹ کر چیتھڑوں میں بدل جاتے ہیں اس لئے ان سے بد دل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ادب کا مطالعہ کرنے والا طبقہ محدود ہے کیونکہ شرح تعلیم محدود ہے مگر جو لوگ آج کا ادب پڑھ رہے ہیں، ان کے دلوں میں گداز اور ذہنوں میں وسعتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اور چونکہ اس ادب کی سمت معین ہے کہ وہ زندگی کے بھرپور پن اور ہمہ جہتی آسودگی اور پاکستان کی سالمیت کی سمت نمائی کرتی ہے اس لئے ذاتی طور پر میں تو بے حد مطمئن ہوں۔

★ اردو ادب کے عالمی ادب میں مناسب مقام حاصل نہ کر سکنے کے اسباب کیا ہیں؟ آپ نے اس سلسلے میں اپنے طور پر کیا کاوشیں کی ہیں؟

❋ صرف ایک وجہ سے اردو ادب، عالمی ادب میں مناسب مقام حاصل نہیں کر سکا اور وہ وجہ یہ ہے کہ اردو ادب کو انگریزی یا دوسری عالمی زبانوں میں سنجیدگی سے منتقل ہی نہیں کیا گیا۔ اگر تراجم کے ذریعے اردو ادب کے شاہپاروں سے یورپ، امریکہ اور ایشیائی ممالک کو متعارف کرایا جائے تو وہ حیرت زدہ رہ جائیں کہ اتنا عظیم ادب ان کی نظروں سے اب تک کیوں پوشیدہ رکھا گیا۔ ذاتی طور پر میں اس سلسلے میں کیا کاوشیں کر سکتا ہوں، البتہ آپ کو مطلع کر سکتا ہوں کہ میری شاعری اور افسانوں کے تراجم روسی، چینی، جاپانی، انگریزی اور جرمن زبانوں میں ہو چکے ہیں اور مراٹھی بنگلہ، تامل، تیلگو، ہندی اور پنجابی میں یہ تراجم مستزاد ہیں۔

★ حقیقی تخلیق کار کے نقوش اس کے بعد کتنی مدت تک باقی رہتے ہیں؟ مثلاً ایک ناقد اور بڑے شاعر ایک محفل میں فرما رہے تھے کہ ندیم صاحب پانچ سے دس سال تک اردو ادب میں زندہ رہیں گے۔

❋ میں اپنے اس مہربان دوست کو اچھی طرح جانتا ہوں جنہوں نے میری موت کے پانچ سال بعد میرے شعر و ادب کو بھی مار ڈالا ہے۔ ان کی خدمت میں اپنا ایک شعر پیش کرتا ہوں:

ایک دل میں بھی مری یاد اگر زندہ ہے
کیا ضروری ہے کہ چرچا رہے گھر گھر اپنا

وہ صاحب کہتے ہیں کہ ایسا انہوں نے کبھی نہیں کہا مگر کاش وہ اس ارشاد کی تردید یا وضاحت ہی فرما دیتے۔ بہرحال اصل چیز ہے وہ لفظ وہ خیال' وہ جذبہ جو زندہ رہتا ہے اور جو ایک عام تجربے کو بھی یونیورسل بنا دیتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو غالب کو تو یار لوگوں نے اس کی زندگی ہی میں مار ڈالا تھا۔ میں اپنے بارے میں کسی خود فریبی میں مبتلا نہیں ہوں مگر اتنا ضرور عرض کروں گا کہ میں نے اعلیٰ معیاروں کا ہمیشہ احترام کیا ہے اور میں نے اب تک جو کچھ تخلیق کیا ہے' اس سے شرمندہ نہیں ہوں' بلکہ اس پر نازاں ہوں۔

★ آزادی جیسی نعمت کو ہم نے چوبیس سال میں ہی ٹکڑوں کی شکل میں بکھیر دیا۔ آپ کی نظر میں اس کے اسباب کیا تھے؟

* نہایت ظاہرو باہر اسباب ہیں۔ مسلم لیگی رہنما قائد اعظم کی زندگی ہی میں اقتدار سے متعلق آپا دھاپی میں مصروف ہو گئے تھے اور بڑی بڑی زمینوں اور عمارتوں اور دیگر قیمتی املاک کی الاٹ منٹ کے لئے یوں دانت بھینچ کر متعلقہ حکام کے پیچھے پڑ گئے کہ پاکستان کے مقاصد کہیں پیچھے روندے پڑے رہ گئے اور ذاتی مفادات سکہ رائج الوقت قرار پائے۔ یہ نہ ہوتا تو یہ کیسے ممکن تھا کہ نہایت معمولی ملازمت کرنے والے لوگ ٹیکسٹائل ملوں کے مالک بن جاتے اور نہایت معمولی کاروبار کرنے والے افراد صنعتوں پر صنعتیں قائم کرتے چلے جاتے؟ ان حالات میں پاکستان کا تحفظ کون کرتا؟ یہی مسلم لیگی تھے جنہوں نے مشرقی پاکستان کے مسلم لیگیوں کو رکنیت کی چٹیں دینے سے انکار کر دیا تھا اور وہیں سے عوامی مسلم لیگ نے جنم لیا تھا جو آخر کار سقوط ڈھاکہ کا سبب بنی۔ اس دردناک صورت حال کی واحد وجہ مسلم لیگی رہنماؤں کی خود غرضی عاقبت نااندیشی اور دولت پرستی ہے اور بس۔

★ ہمارا عمل آج کل جس قسم کا ہے اس سے ہمارے مستقبل کے خدو خال کیا ہوں گے؟

* خدا کے لئے یہ بھیانک سوال مجھ سے نہ پوچھیے کہ میں' جو خود کو ایک ناقابل علاج رجائیت پسند کہتا رہا ہوں' آج کل کے سیاسی حالات کے دباؤ تلے پیا جا رہا ہوں اور ایک گھنی تاریکی نے میرا محاصرہ کر رکھا ہے۔ اس وقت تو بس ایک ہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مملکت کو قائم و دائم رکھے اگرچہ ہمارے سیاست دانوں نے اس امانت میں اندھا دھند خیانت کی ہے۔ صرف ایک مثال کافی ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے سے لیڈر کے خلاف نواب زادہ نصراللہ اور مفتی محمود اور جماعت اسلامی اور دیگر عناصر نے "نظام مصطفیٰ" کے نام پر تحریک چلائی اور اس کے بدلے گیارہ برس کی آمریت خریدی' وہ "نظام مصطفیٰ" کہاں غائب ہو گیا؟ اور کیا جمہوریت اسی کا نام ہے کہ ایک بڑے جمہوریت پسند لیڈر کی وزارت عظمیٰ سے چھٹکارا پانے کے لئے عوام الناس کو سستی جذباتیت کا نشانہ بنایا جائے اور ملک کے مستقبل کا بیڑا غرق کر دیا جائے!

ایک رفاعی ادارہ

السلام علیکم! انجمن بڑا نابیناؤں کیلئے عرصہ دراز سے ایک سکول چلا رہی ہے جس میں قیام و طعام اور تدریس کا مفت انتظام کیا جاتا ہے۔ مروجہ علوم کے علاوہ دستکاری بھی سکھائی جاتی ہے تاکہ یہ معذور بچے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر باعزت زندگی گزار سکیں۔ اقامت گاہ کا بھی مفت انتظام کیا گیا ہے۔ انہیں ہر طرح کے آلات جو نابیناؤں کیلئے مخصوص ہیں۔ مفت مہیا کئے جاتے ہیں۔ اس طرح انجمن کا ماہانہ خرچ کم و بیش تیس ہزار (30000) روپے ہے۔ آپ سے درخواست کی جاتی ہے کہ آپ ماہ رمضان اور شعبان کے حوالے سے اپنی قوم کے ان معذور بچوں کو مت بھولیے۔ نقدی اور اجناس کی صورت میں اپنے عطیات زکوٰۃ' صدقات کی رقوم مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال کر کے ثواب دارین حاصل کریں۔

والسلام
پروفیسر شیخ محمد اقبال
صدر پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ سرگودھا ڈسٹرکٹ
131/129 رحمت پارک کالج روڈ سرگودھا
اکاؤنٹ نمبر حبیب بینک کالج روڈ سرگودھا۔ 4483

احمد ندیم قاسمی

شخصیت اور فن نعت گوئی

حافظ لدھیانوی

"نوائے وقت" کے ادبی ایڈیشن میں جو 20 جون 1991ء کو شائع ہوا تھا' عطاالحق قاسمی نے ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے سلسلے میں کہا تھا۔ "مجھے اس وقت وہی مشکل پیش آرہی ہے جو سعادت حسن منٹو کو احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے پیش آئی تھی۔ منٹو سے کسی نے ندیم کی شخصیت کے بارے میں کوئی سوال کیا تو منٹو نے کہا--- میرا دل اس شخص کے بارے میں لکھنے کو بہت چاہتا ہے لیکن وہ اتنا شریف آدمی ہے کہ مجھے دو چار جملوں کے بعد تان اسی فقرے پر آکر توڑنی پڑتی ہے کہ وہ انتہائی شریف آدمی ہے" میں جناب احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور فن کے بارے میں لکھنے لگا تو کوتاہی قلم کا اندازہ ہوا۔ مجھے منٹو جیسی مشکل پیش آئی۔ منٹو نے تو اس فقرے پر آکر تان توڑ دی کہ وہ "انتہائی شریف آدمی ہے" مگر مجھے یہ فقرہ پڑھ کر خیال آیا کہ کیا انتہائی شریف آدمی پر کچھ نہیں لکھنا چاہئے؟ اس کی شرافت کے قصے' اس کی محبت کی داستانیں' اس کی شفقت کے انداز' اس کی صداقتوں کی کہانیاں--- ان پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے' لیکن بہت کچھ لکھنے کے لئے محبت کی لغت کے الفاظ کا ذخیرہ ہونا چاہئے' الحمد للہ راقم الحروف نے نثر اور نظم میں کبھی عجز قبول نہیں کیا لیکن بعض پہلو دار شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے بارے میں الفاظ کا ذخیرہ بہت محدود نظر آتا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جن خوبصورت الفاظ اور دلکش جملوں سے اپنے ممدوح کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ اردو لغت میں نظر نہیں آتے۔ جیسا کہ کہہ چکا ہوں اس کے لئے محبت کے الفاظ کی ایک علیحدہ لغت ہونا چاہئے جس سے خوبصورت الفاظ چن کر احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کیا جائے۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کی مختلف جہتیں ہیں اور مختلف زاویے ہیں۔ جس شخص کی مختلف جہتیں ہوں' جس کی زندگی کے بے شمار زاویے ہوں' ادبی کاوشوں کی نہ ختم ہونے والی فہرست ہو' جس کے پیار اور شفقت کے خوبصورت انداز ہوں' جو کسی کی دل شکنی کا سوچ بھی نہ سکتا ہو' جس کی محبت کے اتنے انداز ہوں کہ ان کا احاطہ نہ ہوسکے' جس کی بزرگانہ ادائیں ہر مبتدی ادیب اور شاعر کو شاہراہ ادب پر گامزن کرتی ہوں' جس نے کئی نسلوں کو ادب سے روشناس کرایا ہو' جس نے تعریفی کلمات لکھ کر نئے ادیب کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا ہو' جس کی مجلس میں ادب سے دوزانو بیٹھنے اور نظریں جھکا کر خاموش رہنے کا تکلف نہ کرنا پڑے' جو شگفتہ مزاج ہو' جس کا انداز شگفتگی سراسر اپنا ہو' جو بیک وقت صحافی' کالم نگار' افسانہ نگار' غزل گو' نظم نگار' نعت گو' سیاسی مبصر اور ادب کا متوازن نقاد ہو' جو ضمیر کا سودا نہ کرنے والا ہو' جو قلم کی آبرو رکھنے والا ہو' جو صداقت کا علمبردار ہو' جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہ کر بھی دینی اقدار کا پاسبان رہا ہو' ایسی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال کرنا آسان کام نہیں۔ مجھے اس بات نے حوصلہ دیا کہ اگر میں ندیم صاحب کے بارے میں وہ کچھ نہ لکھ سکوں گا جو

ان کا حق ہے اور جو ان کی محبت کا تقاضا ہے تو وہ مسکرا کر درگزر فرمائیں گے اور کہیں گے کہ محبت اور جوش عقیدت اس نامکمل اظہار کا سبب ہے۔

ندیم صاحب افسانے میں دیہاتی ماحول کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گاؤں کا سرسبز و شاداب ماحول سامنے آجاتا ہے۔ قاری اس خوبصورت ماحول میں سانس لیتا' سیر کرتا' لطف اٹھاتا نظر آتا ہے۔ کچھ دیر کے لئے وہ شہر کی دھواں دار فضا' غبار آلود راستوں اور چیختے اور شور مچاتے ماحول کو بھول جاتا ہے۔

ادب کی کوئی صنف ایسی نہیں جس میں ندیم صاحب کے فکر و فن نے اضافہ نہ کیا ہو۔ ان کا فن ایک درد مند دل رکھنے والے' وطن سے محبت کرنے والے' سچائیوں کا خوبصورت اظہار کرانے والے' ماحول کا بے لاگ تجزیہ کرنے والے کا فن ہے جس کا ہر لفظ اس کے خلوص باطن کی شہادت دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کتنے ادیب ایسے ہیں جن کی تحریر اور کردار میں مطابقت ہو۔ مجھے تو اپنی پچاس سالہ ادبی زندگی میں ایک فیصد بھی ایسا ادیب نظر نہیں آیا۔ قاری ان کی تحریریں پڑھ کر ان سے ملاقات کی آرزو کرتا ہے۔ مگر جب ملاقات ہوتی ہے تو اس ادیب اور شاعر کے بارے میں تصوراتی محل زمین بوس ہو جاتے ہیں اور قاری کو مایوسی ہوتی ہے ---- میں چند ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں کہا کرتا ہوں کہ کاش ان کا کلام ہی پڑھتا' ان سے ملاقات نہ ہوتی' تاکہ میرا خوبصورت تصور مجروح نہ ہوتا' عظمت کے محلات یونہی جگمگاتے رہتے۔

جس سے محبت کی جائے' جس کا احترام کیا جائے' جس سے برسوں سے عقیدت ہو تو یاد ہی نہیں رہتا' کہ اس سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ روز ازل ہی سے دو روحوں کی شناسائی تھی جو زندگی کے کسی موڑ پر آکر مل گئیں' ایک دوسرے کے قریب ہو گئیں۔ نصف صدی بیت گئی' بے شمار مشاعروں' ادبی انجمنوں' ادبی حلقوں' اور نجی محفلوں میں ندیم صاحب کے ساتھ رہا' ان کو قریب سے دیکھتے' ان کے مزاج کو سمجھنے' ان کے انداز کو پرکھنے کے بے شمار مواقع میسر آئے مگر کسی ماحول میں ندیم صاحب میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھی۔ وہی دلداری کا انداز' وہی محبت' وہی بزرگانہ شفقت دیکھی۔ ندیم صاحب کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہے۔ جہاں سے کھول کر پڑھ لو' وہی مسکراتا چہرہ' خوبصورت ادبی لطیفے سناتا ہوا شخص' وہی دوست نواز انسان' وہی ادب پر بھرپور گفتگو کرتا ہوا ندیم نظر آئے گا۔ یہ کردار کی پختگی' زندگی کے سنہری اصولوں کی پابندی اور بزرگانہ رکھ رکھاؤ کی بات ہے۔ جس کو عمر بھر نبھانا کارے دارد ہے۔

ندیم صاحب روزنامہ "امروز" کے مدیر تھے۔ میری بے شمار غزلیں "امروز" کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوئیں۔ انھوں نے میری غزل کے کسی مصرعے کو نہ بدلا۔ اور میری حوصلہ افزائی فرمائی اگر وہ کسی مصرع کو بدل دیتے تو میں فخر سے کہہ سکتا تھا کہ ندیم صاحب نے اپنی قیمتی رائے سے مجھے نوازا' میرے لئے یہ رائے سند کا درجہ رکھتی۔ انھوں نے مشاعروں میں بھی مجھے داد سے نوازا۔ میری تصنیفات پر خوبصورت انداز میں اظہار خیال کیا۔ میری نثر اور نظم کے بارے میں تعریفی کلمات لکھے۔ کسی ادیب کا کسی دوسرے ادیب کی حوصلہ افزائی کرنا اور اس کی تعریف کرنا بہت مشکل کام ہے۔ جو کام جس خوشدلی سے ندیم صاحب انجام دیتے ہیں اس کی اردو ادب میں شاید مثال نہ مل سکے۔ بے شمار ادیب اور شاعر ایسے ہیں جنھیں ندیم صاحب نے ادبی شاہراہ پر قدم قدم چلایا' ان کے ادبی سفر میں ساتھ رہے' ان کی رہنمائی کی' ان کو قیمتی مشوروں سے نوازا' "نقوش" اور "فنون" کے ذریعے ان کو عصر حاضر کے ادب سے روشناس کراتے رہے۔ یہ ادب کی ایسی خدمت ہے جسے کوئی بھی دیانت دار ادبی جائزہ نگار فراموش نہیں کر سکتا۔ مجھے اس موقع پر مولانا صلاح الدین احمد کا جملہ یاد آگیا۔ ایک روز ملاقات کے لئے میں "ادبی دنیا" کے دفتر گیا' مولانا بڑے تپاک سے ملے۔ باتوں باتوں میں مشہور افسانہ نگاروں کا ذکر آگیا' مولانا نے فرمایا "حافظ صاحب جو آج کل مشہور افسانہ نگار ہیں ان کے ابتدائی افسانے اگر میں آپ کو دکھاؤں تو سرخ روشنائی زیادہ نظر آئے گی"۔ یہی حال ندیم صاحب کا ہے۔ وہ استادانہ رعب کے قائل نہیں محبت سے اس طرح اصلاح فرماتے ہیں کہ ادیب تلخی محسوس نہیں کرتا بلکہ ندیم صاحب کی محبت اور ان کی ادبی شخصیت کا زیادہ معترف ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آگیا "فنون" کا دفتر انارکلی میں ہوا کرتا تھا۔ میرا پہلا نعتیہ مجموعہ "ثنائے خواجہ" شائع ہوا۔ ندیم صاحب نے خود ہی فرمایا کہ اس کا فلیپ میں لکھوں گا' آپ دو دن بعد تحریر لے جائیں۔ میں حسب ارشاد دو دن بعد "فنون" کے دفتر حاضر ہوا۔ مسودہ میری طرف بڑھاتے ہوئے مسکرائے اور فرمایا کہ میں گھر سے نکل چکا تھا' رکشا میں بیٹھ گیا تھا مگر معاً مجھے خیال آیا کہ آج تو حافظ صاحب کو "ثنائے خواجہ" پر کچھ لکھ کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ رکشا چھوڑا۔ واپس گھر آگیا۔ اپنے کمرے میں گیا۔ یہ تحریر مکمل کر کے ابھی آرہا ہوں۔ یہ انداز محبت اب ناپید ہو چکا ہے۔ وعدے کی پابندی تو کجا' یار لوگ تو کسی کی تصنیف پر چند جملے لکھنا

مصنف پر بہت بڑا احسان سمجھتے ہیں۔ ندیم صاحب ہیں کہ آج بھی اسی محبت کی راہ پر گامزن ہیں۔

چھوٹے چھوٹے واقعات سے انسان کی شخصیت مکمل ہوتی ہے۔ اس کے اقوال و افعال کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی افتادِ طبع کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کا شخصی خاکہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔ ندیم صاحب کی محبت کے بہت سے واقعات ذہن میں محفوظ ہیں جن کی تفصیل کا یہ مضمون متحمل نہیں ہوسکتا۔ ان واقعات کو درج کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ البتہ ایک واقعہ یہاں درج کرتا ہوں اس سے ندیم صاحب کی محبت اور شفقت کے بہت سے پہلو سامنے آجائیں گے۔

بہت مدت کی بات ہے ندیم صاحب کے ساتھ ریڈیو سٹیشن کے مشاعرے سے فارغ ہو کر باہر آیا تو ندیم صاحب نے دریافت فرمایا کہاں جانا ہے؟ میں نے کہا قلعہ گوجر سنگھ۔ ندیم صاحب نے رکشا روکا۔ جب ہم قلعہ گوجر سنگھ پہنچے تو میں نے ندیم صاحب سے پوچھا کہ آپ کو کہاں جانا ہے؟ مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "سمن آباد" میں نے کہا قلعہ گوجر سنگھ کہاں اور سمن آباد کہاں! فرمایا "ادھر سے سمن آباد کو راستہ نکل آئے گا" یہ واقعہ آج تک ذہن پر نقش ہے۔ خدا جانے کتنے احباب سے اس کا تذکرہ کرچکا ہوں۔ یہ واقعہ محبت کا آئینہ دار ہے اور بزرگانہ شفقت کی خوبصورت مثال ہے۔ چھوٹوں کے لئے ایک سبق بھی ہے اور رہنمائی بھی ہے۔

ندیم صاحب کی ادبی خدمات کے سلسلے میں ان کی سالگرہ پر ایک ادبی جشن کا اقدام کیا گیا۔ ندیم صاحب کے ساتھ شام منائی گئی۔ پاکستان بھر کے ادیبوں کی انجمنوں اور ادبی حلقوں نے اس میں شرکت کی۔ کسی ادیب اور شاعر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایسا عظیم الشان ادبی اجتماع شاید ہی کبھی کیا گیا ہو۔ چہرے احترام کے آئینے نظر آتے تھے۔ ان میں محبت اور عقیدت کا رنگ جھلکتا تھا ہر ادبی انجمن نے گلدستوں کی صورت میں گلہائے عقیدت پیش کئے۔ ہال گلستان ادب معلوم ہو رہا تھا۔ عقیدت مندوں سے ہال بھرا ہوا تھا۔ ادباء و شعراء کی نگاہوں کا مرکز ندیم صاحب تھے۔ راقم الحروف نے بھی اس ادبی جشن میں شرکت کی۔ میری نظر سے ندیم صاحب کی رفاقت کے پچاس سال گزر گئے۔ ندیم صاحب کی ادبی زندگی کا ایک ایک ورق کھل گیا۔ کسی ادیب کی ادبی خدمات کا اس انداز میں اعتراف پہلی بار دیکھا۔ اس جشن سے ندیم صاحب کی ملک گیر محبت اور عقیدت کے جذبات سامنے آگئے۔ شرکاء نے تحائف پیش کئے۔ مقالوں کی صورت میں ان کی ادبی خدمات کو سراہا گیا۔ ان کی ادبی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ مجھے اک گونہ مسرت ہوئی کہ یہ قوم جو زود فراموش ہے، جس نے بڑے بڑے ادیبوں کو ان کی وفات کے بعد یکسر فراموش کر دیا، ان کی یاد تو کیا منائی ادبی حوالے کے طور پر بھی کم ہی ذکر کیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے ان کے ریکارڈ شدہ انٹرویوز کو طاق نسیاں میں رکھ چھوڑا۔ ان کو کبھی نشر نہیں کیا — یہی قوم آج ملک کے بزرگ ادیب شاعر اور نقاد کا جشن دھوم دھام سے منا رہی ہے۔

تیس پینتیس سال پہلے کی بات ہے مری میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا۔ دوسرے روز مری کی ادبی انجمن نے ندیم صاحب کے ساتھ ایک شام منانے کا اہتمام کیا یہ اہتمام میونسپل کمیٹی کے ہال میں کیا گیا۔ تمام شعراء جنہوں نے مشاعرے میں شرکت کی تھی ہال میں موجود تھے۔ حافظ عبدالرشید نے جو مری کے شعراء میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، ندیم صاحب سے بھرے مجمع میں سوال کیا کہ سنا ہے آپ منکر خدا ہیں، مذہب سے بیگانہ ہیں، اس سلسلے میں وضاحت کریں۔ ندیم صاحب نے نہایت تحمل اور بردباری سے سب کچھ سنا، فرمایا کہ میرا تو خاندان ہی پیروں کا خاندان ہے، مذہب تو میری گھٹی میں پڑا ہے، میرا ماحول دینی تھا میں نے اسی مذہبی روحانی اور دینی ماحول میں پرورش پائی، میں خداوند کریم کا منکر کیسے ہوسکتا ہوں، آپ کی تسلی کے لئے عرض کرتا ہوں کہ میں خداوند تعالیٰ کو وحدہ لا شریک مانتا ہوں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین مانتا ہوں میرے مذہبی عقاید وہی ہیں جو ایک سچے مسلمان کے ہوتے ہیں۔ میرا ترقی پسند ہونا میری مذہبی زندگی میں رکاوٹ نہیں، میں نے ہمیشہ مذہبی اقدار کا احترام کیا ہے بحمد اللہ میری ذات سے کبھی کوئی ایسی بات منسوب نہیں ہوئی جو مذہبی لحاظ سے قابل گرفت ہو، ایسے ہی ناقدوں سے مخاطب ہو کر ندیم صاحب نے یہ نعتیہ شعر کہا ہے۔

میرے نقاد کو شاید ابھی معلوم نہیں
میرا ایماں ہے مکمل، مرا ایماں تو ہے

ندیم صاحب حج بیت اللہ سے مشرف ہو چکے ہیں مقامات مقدسہ کی زیارت کی کعبۃ اللہ میں حاضری دی، مناسک حج ادا کئے۔ یہ ان کا مذہب سے وابستگی کا علمی ثبوت تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں جو شکوک و شبہات تھے فریضہ حج کی ادائیگی سے ان کا مزید ازالہ ہوگیا۔ ندیم صاحب نے ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر حاضری دی، قرب سرکار دوعالم سے فیض یاب ہوئے، حرم پاک کی پاکیزہ فضا میں چند روز بسر کئے۔ ان کے نعتیہ کلام میں اس حاضری کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے شہر

نبی کے انوار سے دیدہ و دل منور کئے۔ تابندہ نقوش ان کی نعتیہ شاعری میں جگمگاتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قلبی وابستگی کی مثالیں سامنے آتی ہیں۔ ان کی نعتیں خوبصورت الفاظ کا مجموعہ ہی نہیں احساسات و واردات کا آئینہ بھی ہیں۔ حضوری سے پہلے کی نعتیہ شاعری میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ مجبوری میں حضوری کی تمنا ہوتی ہے شہر محبت کو دیکھنے اور اس کی فضاؤں سے قلب و روح کو سیراب کرنے کی۔ وہ خطہ پاک جہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ کے دس سال بسر کئے اور جو زمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارک سے سرفراز ہے' اس کی جلوہ سامانیوں سے متمتع ہونے کی خواہش ہوتی ہے' ہر مقدس مقام کے ساتھ حضور کی حیات طیبہ کا کوئی نہ کوئی واقعہ منسوب ہے۔ ندیم صاحب نے دربار اقدس اور ان مقدس مقامات کی حاضری سے قلب و ذہن روشن کئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ان کے اشعار میں نئے انداز سے جلوہ گر ہونے لگی۔ قرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضیا پاشیوں نے ان کے افکار کو نئی تازگی نئی روشنی بخشی۔ ان کے نعتیہ فن کو نکھارا' ان کے کلام میں مشاہدہ کا حسن جلوہ گر ہونے لگا' تخیل کی کارفرمائیاں عقیدت کا روپ اختیار کر گئیں' خاندانی روحانی فیض نے اس حاضری کو محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آئنہ بنا دیا۔ ان کی نعتوں میں عقیدت مندانہ لہجہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی ادب سے مخاطب کرنے کا انداز نمایاں ہے۔ وہ اپنا سرنیاز صرف اسی در پر جھکانے میں شرف کی انتہا سمجھتے ہیں۔ وہ ایک سچے مسلمان کی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر دنیاوی نعمتیں نہیں مانگتے' بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے دائمی وابستگی کی تمنا کرتے ہیں۔ وہ ہمسائیگی گنبد خضرا کے آرزو مند ہیں۔ ان کا فن آپ کی بیعت کرتا ہے اور چہرہ انور کو قدرت کا آخری شکار سمجھ کر مسلسل زیارت سے فیضیاب ہونے کی تمنا رکھتے ہیں۔ وہ عدل و مساوات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درس محبت تصور کرتے ہیں۔ ندیم صاحب سمجھتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سہارا انہیں کسی بھی مغرور و سرکش انسان کے سامنے جھکنے سے بچاتا ہے۔

پورے قد سے جو کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

ندیم صاحب محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان کو سارے عالم پر پھیلا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ اس فیضان کو ابدی سمجھتے ہیں۔ وہ جناب رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کو اپنی جان سے پیارا اور شب کی سیاہی میں چمکتا ہوا ستارہ قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے جناب کا اسم مبارک دل میں اس طرح اتارا ہے کہ ان کی دھڑکنوں میں شامل ہو گیا ہے۔ وہ حضور کو ہر دکھ کا مداوا اور ہر درد کا چارا تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے نعتیہ کلام میں جا بجا تحریر کیا ہے کہ خدا کی معرفت ساری دنیا کو حضور کے وسیلے سے ہوئی:

اس کا بندہ ہوں جو بندے کو خدا دیتا ہے!

انہوں نے آپ کے اخلاق کریمانہ اور اوصاف حمیدہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضور کی رحمت بے پایاں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے جو دشمن جان کو بھی دعاؤں سے نوازتا ہے۔ وہ کاسۂ گدائی لے کر حضور کے در اقدس پر صدا لگاتے ہیں' جہاں سے کوئی محروم نہیں جاتا۔ وہ تو سائل کو طلب سے بھی سوا دیتے ہیں ندیم صاحب امت مسلمہ کی ہر افتاد کے مداوا کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور انہیں سے دردمندانہ لہجے میں مسلمانان عالم کی سربلندی کے لئے التجا کرتے ہیں۔

ایک بار اور بھی بلطا سے فلسطین میں آ
راستہ دیکھتی ہے مسجد اقصیٰ تیرا

یہ استدعایہ انداز ان کی نعتیہ شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔ وہ غموں کی دھوپ سے تھک ہار کر حضور اکرم کے سایہ دیوار میں آسودگی محسوس کرتے ہیں۔

ندیم صاحب فخریہ انداز میں اور تحدیث نعمت کے طور پر کہتے ہیں کہ غالب اور اقبال تک ہی تیرے کرم کی ضیا پاشیاں نہیں' تو نے ندیم کو بھی اپنے کرم خاص سے صداقت نگاری کا شرف بخشا ہے۔ یہ بات ندیم صاحب کے ایمان کا حصہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفات میں بے مثل ہیں۔ اس کی نظیر نہ پہلے تھی نہ قیامت تک ہوگی۔ ندیم صاحب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو انسانی ارتقا' امن عالم کا منشور اور وقار انسانی کا ذریعہ سمجھتے ہیں' ان کے ہر قول اور ہر عمل کو رہنمائے عالم انسانیت تصور کرتے ہیں' ان کے نقش کف پا کو چراغ ہدایت خیال کرتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ اگر انسان حضور کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائے تو سارا خلفشار مٹ جائے' برتری کا جنون ختم ہو جائے' مساوات انسانی کا شعور پیدا ہو' رنگ و نسل کا امتیاز مٹ جائے' دنیا امن و سکون کا گہوارا بن جائے۔ ان ہی خیالات کا اظہار انہوں نے میرے منظوم سفرنامہ حجاز "معراج سفر" کے دیباچے میں کیا۔ ندیم صاحب نے اس میں کہا

ہے کہ ان تمام مراحل میں جو کمی محسوس ہوتی ہے وہ منیٰ اور عرفات کے ذکر کی کمی ہے جن کے حوالے سے حافظ صاحب حضور گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبے کے بارے میں اپنے منظوم تاثرات یوں پیش کرتے کہ اس انسانی منشور کو منظوم صورت میں پڑھ کر لطف آجاتا!

ندیم صاحب حجۃ الوداع کے خطبے کو انسانی منشور تصور کرتے ہیں' ان کا عقیدہ ہے کہ امن عالم کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ ہر قوم کی رہنمائی کر سکتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہو کر ہی امن عالم قائم ہو سکتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عقیدت کے جذبات موجزن ہوں۔

ندیم صاحب کی نعتیہ شاعری فنی عروج کا مرقع ہی نہیں بلکہ آپ سے بے پایاں محبت کا خوبصورت اظہار بھی ہے۔ نعت کے لئے جن لوازمات کا ہونا ضروری ہے وہ انتہائی آب و تاب کے ساتھ ندیم صاحب کی نعتیہ شاعری میں موجود ہیں۔ نعت میں ان کا اپنا لہجہ ہے' اپنا انداز فکر ہے' ذاتی سوچ ہے۔ ان کی فکر میں نہاں خانۂ دل سے اٹھنے والی آواز کا پرتو ہے۔ نعت میں محسوسات و کیفیات کا یہ انداز بہت کم نعت گو حضرات کو نصیب ہوا ہے۔ وہ مدحت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ یہ پاس ادب کا پہلو ان کی نعتیہ شاعری کا نمایاں حصہ ہے وہ مدحت نگاری کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کرم بے پایاں سمجھتے ہیں اور ان کی خصوصی توجہ کا فیضان خیال کرتے ہیں۔ وہ خود اس کا اعتراف ان اشعار میں کرتے ہیں ۔

میرا معیار غزل خوانی ہے
حرفِ سادہ میں بلاغت ان کی
نعت میری ہے اشارہ ان کا
پھول میرے ہیں تو نکہت ان کی

غزل کے علائم و رموز' فن کے نکھار' ادبی پیرایہ اظہار' قادر الکلامی اور وفور عقیدت نے ندیم صاحب کی مدحت نگاری کو وہ بلند مقام عطا کیا ہے' جس کے لئے وہ ہم سب کی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

بشریٰ رحمٰن کی تصانیف

قلم کہانیاں (افسانے)
عشق عشق (افسانوی مجموعہ)
پشیمان "
تک تک دیدم (سفر نامے)
براہ راست "
دور دیس "

بت شکن (ناولٹ)
لالہ صحرائی "
ایک آوارہ کی خاطر "
بہشت "
اللہ میاں جی "
پے انگ گیسٹ "

لازوال (ناول)
لگن "
خوبصورت "
پیاسی "
چارہ گر "

(ملنے کا پتہ)
8۔ سی۔ احمد پارک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور

احمد ندیم قاسمی

ایک عظیم شاعر ایک عظیم افسانہ نگار

سید احتشام حسین

میں نہ تو نادیدہ عشق کا منکر ہوں اور نہ پہلی نگاہ کی محبت کا' اور کیسے ہو سکتا ہوں جب کہ احمد ندیم قاسمی کے معاملہ میں خود اس جذبہ کا شکار اور اس حقیقت سے آشنا رہا ہوں۔ جس وقت کی بات کر رہا ہوں (میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا اور دیکھا تو آج تک نہیں ہے!) نہ ان کی کوئی تصویر نظر سے گزری تھی اور نہ کسی مشترک دوست کے ذریعہ تعارف ہوا تھا۔ جب قاسمی "جلال و جمال" اور "دشت وفا" کے طرے آویزاں کر کے شاعری کے بازار میں اپنا مول بڑھانے آئے تھے اور "طلوع و غروب" ' "آبلے" ' "سناٹا" اور "برگ حنا" کے طبل و علم لے کر افسانہ نگاری کا میدان جیتنے نکلے تھے۔ سن بھی یاد نہیں' یہی بیالیس تینتالیس ہو گا کہ الطاف مشہدی کے مرتب کیئے ہوئے منتخب افسانوں کے مجموعے "تازیانے" میں احمد ندیم کا افسانہ "طلائی مہر" نظر سے گزرا اور ایسا معلوم ہوا کہ کوئی پھانس سی چبھ گئی۔ معلوم نہیں قاسمی کے فن کا مطالعہ کرنے والے "رئیس خانہ" "ماتم" "الحمد للہ" اور "سناٹا" پڑھنے کے بعد "طلائی مہر" کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے لیکن میرے ذہن میں اس پہلے تاثر کی یاد اب بھی تازہ ہے۔ بچے' تپے ہوئے اور دمکتے ہوئے سونے کی طرح' جس پر زنگ نہیں لگتا!

شاید اسی زمانے میں احمد ندیم "ادب لطیف" سے متعلق ہو گئے۔ یادش بخیر! اس وقت "ادب لطیف" ترقی پسند ادب کا ترجمان سمجھا جاتا تھا اور کچھ نئے سر پھرے ادیب اس سے وابستہ تھے۔ اب جو احمد ندیم قاسمی کا خط ملا ------- خط جو ایڈیٹر کی طرف سے ایک مضمون نگار کے نام نہیں تھا' ایک عزیز کا خط تھا عزیز کے نام' دوست کا دوست کے نام' قبیلے کے ایک فرد کا دوسرے فرد کے نام' خلوص کا خلوص کے نام' ایک خواب دیکھنے والے کا دوسرے خواب دیکھنے والے کے نام' ایک حقیقت جو کا دوسرے پرستار حقیقت کے نام تو میں نے اس نادیدہ عشق کو اور مستحکم کر دیا جس کا میں نے تذکرہ کیا۔ معلوم نہیں قاسمی کو یاد ہے کہ نہیں' میں نے انہیں لکھا تھا کہ آپ کا خط پا کر ایسا محسوس ہوا کہ ہم سینکڑوں برس سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے' مجھے نہیں معلوم' لیکن کبھی کبھی ہوتا یہی ہے ذہن اور جذبہ کے کچھ مشترک تار ایک دوسرے کو چھوتے اور قریب کرتے ہیں' کوئی نادیدہ نصب العین کی جستجو ہم طرحی اور ہم خیالی پیدا کرتی ہے۔ اس وقت تک میں نے مشکل سے قاسمی کے کچھ افسانے' چند نظمیں اور قطعات دیکھے تھے' کچھ انہوں نے اور اس سے زیادہ فن کار کی ذات' اس کی شریفانہ محبت اور خطوں کے اندر سے آواز دیتے ہوئے خلوص نے گرویدہ کیا۔ مومن کا شعر یاد آتا ہے ۔

ہیں' اسیر اس کے' جو ہے اپنا اسیر
ہم نہ جانیں صید کیا صیاد کیا

اگر خیالی وجود ہی سے دلچسپی لینا مقدر ہو۔ نہ ملاقات ہو نہ بات' تو اس کی تلافی اسی صورت سے ہو سکتی ہے کہ اس کے وجود کے مظاہر کو مرکز توجہ بنایا جائے۔ قاسمی کی کہانیاں' نظمیں اور غزلیں پڑھنے میں لطف آنے لگا۔ یہ ان کے تخلیقی ارتقاء کا دور تھا اور وہ بہت کچھ لکھ رہے تھے۔ "دھڑکنیں" چھپ چکی تھیں' "چوپال" ' "بگولے" اور "طلوع و غروب" کی اشاعت ہو چکی تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ "طلائی مہر" کا خالق زندگی کی وسعتوں اور پیچیدگیوں میں داخل ہو رہا ہے' وہ مخلصانہ افراد کے خوابوں اور خیالوں' حادثوں اور وارداتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے پنجاب کے دیہاتوں سے شاعرانہ بانکپن اور وفور شوق کی دولت ملی ہے۔ اس کے گداز دل نے اپنے گرد و پیش کی دنیا اور اس کے کرب و الم کو محسوس کیا ہے اور اس نے وقت کو چلتے اور اپنی لپیٹ میں حالات کو تبدیل

کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ احساس کی سچائی کے بغیر ادب میں جان نہیں آسکتی اور زندگی کی رفتار کو اپنے تجربہ اور شعور کے آئینے میں دیکھے بغیر بیان واقعہ فن نہیں بن سکتا۔ قاسمی میں یہی سچائی اور اس کی طرف یہی انسانی میلان ہے جس نے ان کی فن کاری کو ہر لمحہ روشنی اور توانائی بخشی ہے۔

ان دنوں میں برابر سوچا کرتا تھا کہ قاسمی کی شاعری اور افسانہ نگاری میں کسے زیادہ اہمیت دی جائے۔ ایک دفعہ کوئی نظم ایک پلہ جھکا دیتی تو دوسری بار کوئی افسانہ ذہن کو دوسری جانب موڑ دیتا۔ اس زمانے میں افسانوں کے مجموعوں میں "گرداب" کا اضافہ ہوا' نظموں کا پلہ پھر ہلکا ہوتا محسوس ہونے لگا اور میں نے اس نئے مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے اس تذبذب کا اظہار بھی کیا اور شاید کسی خط میں خود قاسمی سے بھی اپنی اس ترجیح کا ذکر کیا۔ یاد آتا ہے کہ انہوں نے جواب میں کوئی ایسی بات لکھی جسے سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ انہیں اپنی شاعری زیادہ یا کم سے کم اپنے افسانوں کے برابر ہی پسند ہے۔ میں اس کیفیت کو سمجھ سکتا ہوں۔ صحت کی خرابی اور بعض دوسرے وجوہ سے قاسمی ادب لطیف سے الگ ہو کر پھر انگہ میں قیام پذیر تھے اور اپنا مجموعہ کلام "جلال و جمال" ترتیب دے رہے تھے۔ شاعری کی فضا ان پر طاری تھی اور نظمیں تنہائی میں انہیں جاں بنی ہوئی تھیں اس لئے اگر انہیں ان دنوں اپنی نظمیں افسانوں سے زیادہ پسند تھیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میں نے بھی اس وقت "گرداب" کے تبصرے میں یہ بات جس طرح کہی تھی اس سے مفاہمت کی ایک صورت پیدا ہوئی تھی۔

ابھی کل کی بات ہے کہ احمد ندیم نے افسانے لکھنا شروع کیے' رسالوں میں افسانے دیکھے' پھر انہی کے پہلو بہ پہلو ان کی نظمیں نظر آئیں اور یہ اندازہ کرنا مشکل معلوم ہوا کہ قاسمی اچھے افسانہ نگار ہیں یا اچھے شاعر۔ پھر افسانہ نگار احمد ندیم نے شاعر احمد ندیم کو پیچھے چھوڑ دیا' لیکن اس کے بعد یہ سوال پھر پیدا ہو رہا ہے کہ افسانہ نگاری نے ان کی شاعری کو نقصان پہنچایا یا شاعری نے افسانہ نگاری کو فائدہ؟ سو جس نے بھی احمد ندیم کے افسانے دیکھے ہیں وہ نہایت آسانی سے فیصلہ کر لے گا کہ ان افسانوں کا خالق شاعر بھی ہے۔"

یہ غالباً 1946ء کی بات ہوگی۔ اس کے بعد کچھ ویران دن آئے۔ جلنے' کڑھنے اور خون دل پینے کے دن' زخموں اور جراحتوں کے دن۔ کچھ دنوں تک کسی کو کسی کی خبر نہ رہی۔ پھر زخم اپنے نشان اور داغ چھوڑ کر اچھے ہو گئے یا خراب ہو کر ناسور بنے۔ حالات کسی قدر رو براہ ہوئے تو یادوں کے بادل پھر گھرے اور برسے' مخلص چہرے پھر سامنے آئے' دلوں کی دھڑکنیں پھر قریب سنائی دیں اور کانپتے ہاتھوں نے پھر زندہ رہنے' محبت اور انسانیت کے راستے پر چلتے رہنے اور دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیریں تلاش کرنے کے عہد نامے لکھے۔ قاسمی نے اطلاع دی کہ وہ ادارہ فروغ اردو لاہور سے نکلنے والے نئے ماہنامے "نقوش" کی ادارت کر رہے ہیں تو گویا ارادہ اور عمل کی قوتیں بیدار ہیں۔ کام کا حوصلہ باقی ہے' حالات بہتر ہو رہے ہیں اور فضا سازگار ہے! کچھ دنوں کے بعد "نقوش" کے امن نمبر کا اعلان ہوا۔ ترقی پسندوں اور ان کی مخالف قوتوں کی صف آرائی کی خبر ملی۔ قاسمی کے مجاہدانہ سرگرم عمل ہونے اور مطعون کیے جانے کے چرچے ہوئے اور آزادی رائے کے لئے جیل جانے کا حال معلوم ہوا۔ دل نے کہا یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا! ان حالات میں بھی وہ اسی لگن اور تخلیقی جوش سے لکھتے رہے حالانکہ اب ان کے افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کے ساتھ ساتھ شہری زندگی کے نقش بھی ابھرنے لگے تھے۔ تجربہ کی جھولی میں زندگی اصلی اور نقلی جواہرات اور زیادہ ڈال رہی تھی لیکن اس وقت تک مجھے قاسمی کے دیہات ہی اچھے لگتے تھے۔ شاید اسی لئے کہ مجھے خود بھی دیہات سے ایک باطنی ربط ہے۔ میری روح وہیں کہیں گندی گلیوں' کچے مکانوں' اجڑے کھنڈروں' ہریالے کھیتوں اور بگولے اڑاتے میدانوں میں بستی ہے۔ "طلائی مہر" کے پسند کرنے میں کیا یہ جذبہ شامل نہ رہا ہوگا؟ معلوم ہوتا ہے کہ قائم چاند پوری نے میرے ہی لئے کہا تھا۔

موافقت کی بہت شہروں سے میں لیکن
وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں

میں نے گرداب کے تبصرے میں کچھ اس کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ لیکن اب تو میں ذکر کر رہا ہوں تقسیم کے بعد کا' جب "جلال و جمال" اپنی ساری رعنائیوں کے ساتھ شائع ہوئی اور قاسمی کا قد بہ حیثیت شاعر کے بہت اونچا ہو گیا۔ جولائی 1949ء میں ریڈیو سے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا:

"احمد ندیم قاسمی نے اپنے فنی نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے جو تمہید لکھی ہے وہ کئی حیثیتوں سے بہت اہم ہے۔ اگرچہ انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ سو فیصدی قابل قبول نہیں ہیں مگر ان کی اہمیت یہ ہے کہ ان سے نظموں کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے رومانیت' غنائیت' حقیقت نگاری' انقلابی شاعری اور غزلوں کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے ہیں اور جس تنقیدی قوت کو کام میں لا کر کسی مخصوص طرز

فکر کے ساتھ بننے سے گریز کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ اس سے ان کے مطالعہ کی وسعت اور آزاد فکری صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے ..... دس سال میں کہی ہوئی ان نظموں کے مطالعہ سے یہ پتہ آسانی سے چلتا ہے کہ احمد ندیم کے خیالات میں تغیر اور ارتقاء کے کئی دور آئے ہیں اور 1944ء کے قریب وہ خیال اور انداز بیان دونوں میں ترقی کی اس سرحد کو چھو آئے جسے شاعری کی زبان میں پختگی کہا جاتا ہے۔ اس موڑ پر ان کے رومانی ابہام پر سماجی حقیقتوں کے سائے بھی منڈلاتے نظر آنے لگتے ہیں اور "راستے کا موڑ" جیسی نظم جنم لیتی ہے۔ اس کا نام' اس میں چھپی ہوئی گہری انسانیت' اس کا تیکھا پن اور طرز ادا' ہر ایک میں رومانی شاعر کے اندر جنم لیتے ہوئے پہلی شاعر کے وجود کا پتہ چلتا ہے ..... ان کے فن میں خامیاں بھی ہیں' لیکن ان کی کوشش ایک سچے شاعر کی کوشش ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ "جلال و جمال" اردو کے شعری ادب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ جس مجموعہ میں "پرتو" ' "آرزو" ' "کرنیں" ' "میری زمین" ' "تسنیم کے نام" ' "شکاری" ' "ترک محبت کے بعد" ' "حریت فکر" ' "افشائے راز" ' "شکست و ریخت" ' "ردعمل" ' "راستے کا موڑ" ' "ماہتاب فردا" اور "گریز" ایسی نظمیں موجود ہیں اس کے دیرپذیر ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے۔"

یہ طویل اقتباس اس لئے نقل کر دیا کہ قاسمی کی شاعری کے متعلق میرے اس وقت کے تاثرات کا اندازہ ہو سکے اور یہ سطریں پرانے کاغذوں سے نکل کر کہیں محفوظ بھی ہو جائیں۔

اس کے بعد میں باہر چلا گیا اور کچھ دنوں کے لئے رابطے ٹوٹ سے گئے بس اتنا یاد ہے کہ قاسمی نے اپنی شاعری کے سلسلہ میں میری مبارکباد کے جواب میں ایک طویل اور دلچسپ خط لکھا (افسوس کہ میرے بہت سے کاغذوں کے ساتھ یہ خطوط بھی ضائع ہو گئے) اور اپنی زندگی کے ایک نئے اور خوشگوار سفر کا ذکر کیا۔ یہاں سے نقوش کچھ دھندلے ہیں۔ قاسمی اخبارات میں کام کرنے لگتے ہیں' میں ان کے افسانے بھی پڑھتا رہا اور نظمیں بھی۔ لیکن باقاعدہ دور اس وقت جڑتی ہے جب قاسمی نے "کتاب نما" اور "نقوش" کا سلسلہ شروع کیا اور مجھے پھر یاد کیا۔ اس درمیان میں میری فکریں اور مصروفیتیں اتنی بڑھیں کہ وہ جو زنجیر کی ہر کڑی کو کھینچ تان کر دیکھ لینے کی عادت تھی وہ بھی بدل سی گئی اور حالات نے کتابوں کی دستیابی اور ان کے مطالعہ کی راہ میں دشواریاں پیدا کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "آبلے" کے بعد افسانوں کا کوئی مجموعہ باقاعدہ نہ پڑھ سکا حالانکہ جو افسانے جہاں بھی پڑھنے کو ملے پڑھتا رہا۔ "شعلہ گل" نہیں دیکھ سکا لیکن جو نظمیں رسائل میں ملیں دیکھتا رہا۔ "دشت وفا" کی خوب سیر کی اور اس میں ان ساری فکری اور فنی قدروں کو شگفتہ ہوتے دیکھا جنہیں میں ابتدا سے قاسمی سے وابستہ کرتا رہا ہوں۔

کیا افسانہ نگاری اور کیا شاعری' دونوں قاسمی کے ذہنی ارتقاء اور تخلیقی لگن کی ایک دلکش داستان سناتی ہیں ——— وہی مشاہدہ کی گہرائی اور تازگی' وہی انداز بیاں کی خوشگواری' وہی اہم اور غیر اہم کا امتیاز' وہی رومانی وفور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی حقیقت پسندی' وہی گداز قلب اور وہی انسان دوستی' وہی احترام فن اور وہی انفرادی انداز نظر ——— ایک اچھے شاعر اور افسانہ نگار' ایک اچھے دوست اور اچھے انسان کی ساری خوبیاں قاسمی میں جمع ہو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انہیں پنجاب کے دیہاتوں نے' ماحول کی کشمکش نے' پیرزادگی کے اخلاقی تصور نے' علم و آگہی کی پیاس نے اور انسانی محبت کے احساس نے جو کچھ دیا ہے وہ ان کے حسین اور توانا پہلوؤں کو اپنے افسانوں اور اپنی نظموں کے ذریعہ عام کر رہے ہیں۔

مجھے مسرت اور اعتماد ہے کہ اس نادیدہ محبت میں مجھ سے غلطی نہیں ہوئی۔

(روزنامہ "امروز" 21 نومبر 1976ء

اشفاق احمد ورک کی تازہ تصنیف

"دو قلمی دشمنی"

اشفاق احمد ورک مزاح نگار کی حیثیت سے میدان ادب میں داخل ہوا ہے لیکن اس طمطراق سے آیا ہے کہ لگتا ہے ہمارے بڑے مزاح نگاروں سے دست پنجہ ملائے بغیر نہیں ٹلے گا ——— ممتاز مفتی

میں نے اشفاق احمد ورک کے مضامین بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھے۔ نئے شگفتہ نگاروں میں ایک منفرد لہجہ اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔
مشتاق یوسفی

اشفاق دبستان یوسفی کا پیرو خصوصی ہے اور اس دبستان کا قابل قدر نمائندہ قرار پاتا ہے ——— انور مسعود

الحمد پبلیکیشنز' رانا چیمبرز سیکنڈ فلور (چوک پرانی انارکلی) لاہور

احمد ندیم قاسمی

شریف کنجاہی

ماضی کی طرف مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے وہ سال مہینہ اور دن تو یاد نہیں آتے جب ندیم صاحب سے شناسائی ہوئی لیکن یہ احساس ضرور ہے کہ جب سے یہ تعلق پیدا ہوا اس میں تا بامروز اضافہ ہی ہوا ہے۔ اس اضافہ میں سچ تو یہ ہے کہ ندیم صاحب کی اپنی ذات کو زیادہ دخل ہے ورنہ مجھ ایسا گریز پسند انسان اکثر روابط کی آبیاری میں اگر بخیل نہیں تو کم کوش ضرور ہوتا ہے اور نباہنے کی مسافت اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس ندیم صاحب کو قدرت نے یہ جوہر بڑی فراخ دلی سے عطا کیا یا یوں کہہ لیجئے کہ انہوں نے اس کو اپنے اندر ڈیویلپ کر لیا چنانچہ ان کا یہ رویہ کچھ مجھی سے مخصوص نہ تھا۔ یہ ان کی فطرت یا فطرت ثانیہ ہے کہ وہ جس میں کسی قسم کا کوئی سپارک دیکھتے ہیں اسے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سپارک کے ساتھ میں نے "کسی قسم" کا اضافہ اس لئے کیا ہے کہ صوفیا کی طرح وہ جمال و نور کے کسی خاص روپ کے قائل نہیں ہیں اور جیسا کہ ناہید نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ وہ اچھی بال پوائنٹ پنسل پا کر بھی اسی قدر محظوظ ہوتے ہیں جس قدر کسی اچھے سگریٹوں کے پیکٹ یا اچھے انسان کو پا کر۔ پھر اس اپنانے کی آرزو میں چونکہ "مادیت" کو بہت کم دخل ہوتا ہے اس لئے میں نے کم سے کم 1973ء سے کہ میں لاہور میں تقریباً مستقل طور پر آگیا ہوں' یہی دیکھا ہے کہ ندیم صاحب کے پاس آنے والوں کے حلقے میں اضافہ ہی ہوتا گیا ہے۔ ان آنے والوں میں سے بیشتر وہ ہیں جن کی جراحتوں پر ان کے خلوص نے مرہم کا کام کیا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ بعض چہروں کو میں نے فوکس میں آتے اور پھر "آؤٹ آف فوکس" ہوتے بھی دیکھا ہے لیکن اس میں بھی قصور میری دانست اور میرے مشاہدہ کے مطابق کیمرہ مین کا نہیں' فوکس میں رہنے والوں کی خواہش کے طفلانہ پن کا ہوتا ہے کہ کیمرہ کسی عناد کے باعث ایک سے گھوم کر دوسرے کی طرف نہیں چلا جاتا۔ خود بزم سے روٹھ کر چلے جانے والوں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ ندیم صاحب نے ہر مشکل وقت میں حتی الامکان ان کی اعانت کی ہے۔ تعاون کا یہ تسلسل کیوں ان کی ذات کا ایک حصہ بن چکا ہے یہ ایک ایسا موضوع ہے جو ہمیں انسانی نفسیات کی دشوار گزار وادیوں میں لے جاتا ہے اور ماہرین کی اس ضمن میں موشگافیوں کے جال میں نہ پڑتے ہوئے میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ ہمارا ہر عمل کسی داخلی تحریک یا ضرورت کا بروز ہوتا ہے اور یوں جب ہم احمد شاہ کو احمد ندیم ہوتے دیکھتے ہیں اور اس عمل کو سمجھنا چاہتے ہیں تو یہی بات نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان کے اندر دوسروں سے تعاون کرنے اور ان کو اپنانے کی خواہش اس تخلص کا خارجی روپ ہے جیسا کہ خود انہوں نے بھی اپنے ایک شعر میں اس طرف اشارہ کیا ہے:

یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے کہ "ندیم"
میرا کردار کا کردار ہے اور نام کا نام

سماجی زندگی میں دوسروں کو اپنانے کے کئی پہلو ہیں۔ جانگلیوں میں کسی کی "سچ کلیان بھینس" کو رات کی تاریکی میں چرا کر لے جانے والا بھی اپنانے کی تحریک اور ضرورت کے زیر اثر ہی ایسا کرتا ہے اور اغوا کرنے والے سے لے کر چھوٹی موٹی حدود شکنی کرنے والوں تک ہر کوئی اسی قسم کی داخلی تحریک یا ضرورت سے مجبور قدم اٹھاتا ہے لیکن ایسے اقدامات چونکہ زندگی کے منفی رویہ کا مظہر ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت جذباتی توجیہات کے باوجود دامن کے داغوں کی ہوا کرتی ہے اس لئے

اقدام کرنے والوں کو اس سے وہ بلندی حاصل نہیں ہوتی جو داخلی سرور و سکون کا ثمر دیتی ہے۔ ندیم صاحب اس لحاظ سے معاصرین میں قابل رشک مقام رکھتے ہیں کہ ان کے دامن پر اس قسم کے کسی منفی رویے کا کوئی داغ نہیں ملتا۔ یہیں سے ان کا اسلوب دوستی و رفاقت بھی پھوٹتا ہے اور نظریہ دوستی بھی۔ ان کے حلقہ دام وفا میں سے نکل جانے والوں سے بھی میں نے یہ نہیں سنا کہ ندیم نے فلاں ذاتی غرض یا مصلحت کے تحت فلاں چکر چلایا تھا یا فلاں جل دیا تھا اور آشنا فروشی کی تھی۔ اسی طرح ان کے سایہ شفقت میں آکر ستانے والی لڑکیوں اور عورتوں میں سے بھی کسی کے لبوں نے ان کو وہ الزام نہیں دیا جو اساطیر میں احسن القصص کا عنوان بنا تھا اور آج سے تقریباً تیس سال پہلے جب حاجرہ مسرور کے الفاظ میں ڈھاکہ کی کسی محفل میں یہ چٹ پٹا سا فقرہ کسی دانشور فنکار نے عالم سرور میں کہا تھا کہ "یہ ندیم فراڈ ہے یا فرشتہ۔ بھلا کوئی انسان اتنا اچھا کیسے ہو سکتا ہے کہ غیر لڑکیوں کو بہن کہے بھی اور بہن سمجھے بھی۔" تو ایک پہلو سے یہ اس امر کا اعتراف بھی تھا کہ فن کاروں کی اکثریت کسی کو بہن کہہ تو سکتی ہے سمجھ نہیں سکتی۔ ندیم نے آج سے تیس برس پہلے کی جواں عمری میں جن دو بہنوں کو لکھا تھا کہ "آپ نے مجھے بھائی سے مخاطب کیا میری عزیز متاعوں میں اضافہ ہو گیا۔ آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آتے گئے اور آج ہم سگے بہن بھائی کی طرح زندہ ہیں۔" ان بہنوں کے مخلصانہ رد عمل نے ڈھاکہ والے فقرے کا جواب تیس سال کے طویل عرصہ میں دے دیا کہ ندیم فراڈ ہے یا فرشتہ کہ فراڈ آدمی دوسروں کو بے وقوف بنانے میں تو ممکن ہے کامیاب ہو جائے' اگرچہ وہ بھی وقتی طور پر' لیکن وہ دوسروں میں مخلصانہ جذبات کو تا بدیر زندہ نہیں رکھ سکتا اور ان سے اس قسم کے مضمون نہیں لکھوا سکتا جو ان دونوں بہنوں نے ندیم صاحب کے بارے میں لکھے۔

یہ باتیں 1947ء کی ہیں۔ بچ کے ان سالوں میں نہ جانے کتنی اور لڑکیاں صحرائے حیات کی کڑکتی دھوپ میں گھبرائی ہوئی اس شجر سایہ دار تلے آئیں' بیٹھیں' سستائیں اور چلی گئیں لیکن کسی مسافر نے یہ شکایت نہیں کی کہ یہ سایہ کیکر کا خار دار سایہ تھا۔ سایہ دار شجر کی ترکیب سے مجھے پروین شاکر یاد آگئیں جو اس چھاؤں میں ابھی تک آنے والیوں میں سے غالباً سب سے آخر میں آئیں اور دیکھئے کس احساس تقدس کے ساتھ:

وہ سایہ دار شجر
جو مجھ سے دور' بہت دور ہے مگر اس کی
لطیف چھاؤں' تحلل نرم چاندی کی طرح
میرے وجود' مری شخصیت پہ چھائی ہے
وہ ماں کی بانہوں کی مانند مہرباں شاخیں
جو ہر عذاب میں مجھ کو سمیٹ لیتی ہیں
اداسیوں کی کسی جاں گداز ساعت میں
میں اس کی شاخ پہ سر رکھ کے روئی ہوں جب بھی
تو میری پلکوں نے محسوس کر لیا فوراً
بہت ہی نرم سی اک پنکھڑی کا شیریں لمس
میں ایک ننھی سی بچی ہوں اور خوشی سے
بس اس کی انگلیاں تھامے اور آنکھیں بند کئے
جہاں جہاں لئے جاتا ہے' جا رہی ہوں میں ---!

لڑکیوں کے اندر یہ قدسی احساس پیدا کرنا کہ وہ کسی مرد کو اعتماد کے ساتھ بھائی کہہ سکیں یا ماں کا نرم 'آنچل سمجھ سکیں'
ایک ننھی سی بچی کی معصومیت کے ساتھ اس کی انگلیاں تھام کر چل سکیں' تہذیب قلب و نظر کے طویل اور کٹھن عمل ہی سے ممکن ہے۔ یہ سم الغار کو مشرقی آداب زندگی کی روایت کی نرم لیکن مسلسل آنچ میں کشتہ کر کے اسے زہر سے تریاک بنانے کا عمل ہے۔ لیکن مسلسل آنچ برداشت کرتے جانا
ہر کسی سے ممکن نہیں ہوتا کہ روزہ رکھنا اور نبھانا' روزہ نہ رکھنے سے بہرحال کڑا مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ مادیت کو غیر مادیت پر قربان کر دینا ہے۔ رنگ کی جگہ بو سے واسطہ رکھتا ہے اور عید کی حقیقی مسرت انہیں کا حصہ ہوتی ہے جو فاقہ کشی کے طویل سفر کو استقلال سے طے کرتے ہیں' سوئیوں کے لالچ میں نہیں۔ عہد نبھانے کا جشن منانے کے سرور بخش تصور کے ساتھ۔ جذبات کی یہ عید ندیم اور صرف ندیم کا حصہ ہے اور کم سن' ہم سن بلکہ معاصرین کے لئے اس تہذیبی سفر پر چلنے کی دعوت بھی کہ ایں نشہ .من نیست اگر با دگرے ہست۔

بات ختم کرنے سے پہلے میں ندیم صاحب کی زندگی کے ایک اور رخ کی طرف آنا چاہتا ہوں جو ان کی ندیمیت کا اسی قدر کامیاب روپ ہے جس قدر دوسرے دونوں روپ جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان کی بیگم ان کے قبیلے ہی سے ہیں اور اس دور کے عام مزاج کے مطابق

جب ان کی شادی ہوئی تھی' علوم جدیدہ سے معروف معنوں میں نا آشنا۔ ان حالات میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اہل قلم کا ذوق جمال وظیفہ عیال پر غالب آجاتا ہے اور گھریلو زندگی ہماری فلموں کی طرح ہنگامہ پرور ہو جاتی ہے اور یوں ربط باہم کی دیوار خم دار اٹھنے لگتی ہے۔ یہ خم دار دیوار گر پڑنے کے مستقل خطرے کا اعلان بنی' کبھی بھی اہل خانہ کو اس سکون سے بیٹھنے نہیں دیتی جو ندیم صاحب کے افراد خانہ کی متاع گراں ہے اور اس لحاظ سے بھی ندیم صاحب ہم عصر ارباب قلم کے ان معدود سے خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جن کی عائلی زندگی گرداب آشنا نہیں ہے۔ کافی حد تک اس کا سرا بھی ندیم کی اس طبیعت کے سر ہے جس کی جڑیں دوسروں کو اپنانے اور ان کے جوہر کی قدر کرنے کی داخلی تحریک میں سے اغذ غذا کرتی ہیں اور جس کا خارجی روپ ندیم کے ایک محبت کرنے والے خاوند کے روپ میں جب ابھرتا ہے تو کسی عورت کے دخل در معقولات ہونے کے خدشات کو جلو میں لئے نہیں آتا اور جب ایک شفیق باپ کے پیکر میں نمودار ہوتا ہے تو ناہید بیٹی بے اختیار پکار اٹھتی ہے ___ کہ میرے لئے یہی بات عمر بھر فخر کرنے کے لئے بہت ہے کہ میں ندیم کی بیٹی ہوں۔

1991ء میں اس مضمون کا بخت جاگا کہ اسے جلال پور جٹاں کے گورنمنٹ گرلز کالج میں (شاہین مفتی صاحب جس کی پرنسپل ہیں) ندیم صاحب کے اعتراف فکر و فن کی تقریب میں پڑھا گیا۔

یہ مضمون میں نے آج سے بہت پہلے لکھا تھا اور اپنی اس جھجک کے باعث غیر مطبوعہ رہا کہ "فنون" کو بھیجنا عجیب سا لگتا تھا اور میں عادتاً فنون کے علاوہ کم ہی کسی اور جریدے سے بے تکلف ہوا ہوں۔ آج سے چند سال پہلے میرے پڑوسی مرحوم قربان طاہر نے اسے پڑھنے کے لئے لیا اور اپنے چند صفحات کے بے قاعدگی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "چیلنج" میں چپکے سے شائع کر دیا۔ اس عرصہ میں میری بات کی تصدیق مزید کے لئے قدرت نے ایک اور لڑکی کو بھیج دیا اور یوں پروین شاکر سے "آخرت" کا اعزاز ایک خاموش چابک دستی کے ساتھ لے کر اپنے ماتھے کا زیور بنا لیا۔ اس لڑکی کا نام منصورہ ہے جو اپنا کتابوں کی اشاعت کا پروگرام بھی کمال محنت سے چلاتی ہے اور ندیم صاحب کی اتنی بے لوث خدمت بھی کرتی ہے جو صرف سگی بیٹیاں ہی کر سکتی ہیں۔ وہ آج کل "فنون" کی مدیر منتظم بھی ہے اور یوں اس نے ندیم صاحب کے رسالے کا انتظام سنبھال کر انہیں صرف رسالے کی ادارت کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اس نے ندیم صاحب سے اظہار عقیدت کرتے ہوئے کتنی ہی نظمیں کہی ہیں جن میں سے "بابا سے ایک سوال" مطبوعہ نظموں میں سے غالباً تازہ ترین ہے کہ وہ اپریل 1992ء کے "فنون" میں چھپی تھی۔ نظم ایک سوال کے روپ میں یوں چلتی ہے:

مرے بابا!
یہ کیسے سرد چہروں سے بھرے شہروں میں
جینے کی سزا سونپی گئی ہم کو
یہ کیسے رات جیسے دن' ملے ہیں سانس لینے کو
جہاں سینے میں نیزے کی انی چلتی ہے
تو ہم سوچ لیتے ہیں
ابھی زندہ ہیں' جیتے ہیں
یہ کیسے شہر ہیں جو جاگتی آنکھوں سے سوتے ہیں
یہاں تو سب کی عمریں
گدلے گدلے پانیوں کی سبز کائی میں گندھی ہیں

ایسے پانیوں کی سبز کائی میں عمریں کاٹتی لڑکیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے منصورہ نظم کے دوسرے بند کو یوں شروع کرتی ہے:

مگر بابا!
تمہاری مہرباں' کچھ سوچتی آنکھوں کی دنیا
اپنی دنیاؤں سے کتنی مختلف ہے
نجانے ذات کے کس منطقے پر جی رہے ہو تم
تمہاری سوچ کے پیکر
نجانے کس سنہری خواب کی کرنوں نے ڈھالے ہیں
تمہاری آنکھ کے اعجاز تک کیسے رسائی ہو

آنکھ کا یہی اعجاز صدیوں سے انسان کو کسی نہ کسی روپ میں انسان کا گرویدہ بناتا چلا آیا ہے اور لوگ جان و دل باختہ مرید' پیر و کار یا عقیدت مند بنتے آئے ہیں کہ یہ اعجاز ہم میں سے اکثر کی داخلی ضرورت ہوتا ہے۔ فارسی کے اس مشہور مصرعے میں کہ "دیرینہ سال پیرے پرورش نیک نگاہے" میں بھی یہی حقیقت بے نقاب ہے اور منصورہ کی اس خوبصورت نظم کے آخری مصرع میں بھی۔

باہر کے رابطے، اندر کے رشتے

(ندیم کی ساٹھویں سالگرہ پر)

رحیم گل

عام طور پر ندیم صاحب سے میرا رابطہ بہت کم رہتا ہے، مگر جہاں تک ذہنی اور قلبی رشتے کا تعلق ہے۔ اس کی عمر ربع صدی سے بھی کچھ زیادہ ہے ---- ندیم صاحب ساٹھویں سالگرہ منا رہے ہیں اور میں ہاف سنچری سے ایک دو حزلیں ادھر کھڑا ہوں، مگر ہمارے تعلق خاطر کا معصوم بچہ مکمل طور پر جوان ہو چکا ہے۔

ندیم صاحب کو میں اس زمانے سے جانتا ہوں۔ جب اپنے آپ کو نہیں جانتا تھا ---- اپنے آپ کو جانا، تو مجھے ندیم صاحب کو بھول جانا چاہیے تھا، مگر وہ تو پلٹ کر میرے دل میں بیٹھ گئے۔

جب میں باجرے کے کھیت کے منڈیر پر پاؤں پھیلا کر ندیم صاحب کے افسانے پڑھتا تھا، تو ایک چھم چھم کرتی ہوئی لڑکی، ہرے بھرے باجرے کے کھیت سے جھانکتی نظر آتی تھی ---- یہ ندیم صاحب کے افسانوں کا اثر تھا کہ پنجاب کی الھڑ نیار میرے ذہن میں بری طرح بیٹھ گئی تھی۔

یہ کریڈٹ بھی ندیم صاحب کو جاتا ہے، کہ بالآخر میں اس الھڑ نیار کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور آج وہ باجرے کے کھیت میں سے جھانکتی ہوئی نیار میرے بچوں کی ماں ہے۔

اور یہ ڈس کریڈٹ بھی ندیم صاحب کو ہی جاتا ہے کہ ایک بار ان کے افسانے کے نشے میں اس قدر سرشار ہو گیا تھا کہ منڈیر پر لیٹے ہوئے سانپ پر بے خبری میں ہاتھ رکھ دیا تھا اور سانپ نے مجھے ڈس لیا تھا اور میں مرتے مرتے بچا تھا، مگر اس ڈس کریڈٹ سے ایک کریڈٹ نے بھی جنم لیا تھا۔ سانپ کے زہر نے میرے جسم میں داخل ہو کر میری فطرت کے زہر کو مار ڈالا تھا ----!

بعض اوقات ان کے افسانوں کے ایکسپریشن سے متاثر ہو کر میں ورق پلٹ کر ان کی تصویر دیکھتا، کہ اس شخص نے کیسے کیسے خوبصورت عشق کئے ہیں۔ لیکن ان کے چہرے پر ایسی شرافت اور آنکھوں میں ایسی طہارت نظر آتی، کہ متزلزل ہو جاتا اور سارے الزامات واپس لے لیتا۔

میری عمر اس وقت سترہ اٹھارہ برس کے قریب ہوگی، جب میں نے ندیم صاحب کی تصویر دیکھی تھی۔ یہ سچ ہے کہ میں نے ندیم صاحب کی تصویر دیکھ کر ان کی شخصیت سے قربت محسوس کی تھی۔ جس طرح بعض لوگوں کی شکلیں دیکھ کر ان سے خدا واسطے کا بیر ہو جاتا ہے اس طرح مجھے ندیم صاحب سے خدا واسطے کی محبت ہو گئی تھی۔ دیکھا ہے لوگ آپس میں جھگڑتے ہیں کہ ندیم صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں اور بڑے شاعر ہیں۔ افسانہ نگاری محض بہتان ہے۔ اور بعض انہیں بنیادی طور پر افسانہ نگار کہتے ہیں۔ بڑا افسانہ نگار۔

میں اپنی بات بتاؤں۔ میں جب تک لاہور نہیں آیا تھا۔ انہیں افسانہ نگار ہی سمجھتا رہا۔ لاہور آکر انکشاف ہوا کہ وہ تو شاعر بھی ہیں

اور چند گنے چنے شاعروں میں سے ایک ---- مثلاً یہ شعر بھی ندیم صاحب کے ہیں۔

انداز ہو بہو تری آواز پا کا تھا
باہر نکل کے دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا
ندیم کوئی مرے فن کا اجر کیا دے گا
میں خاک چاٹ کے بھی نشۂ ہنر میں رہوں

تب مجھے ان کے افسانے کنجری' سناٹا' گنڈاسا یاد آئے اور میں فیصلہ نہ کر سکا کہ ندیم صاحب شاعر بڑے ہیں یا افسانہ نگار بڑے؟ اخبار نویس بڑے' مدیر بڑے' اور یا انسان بڑے ------- !؟

اس شہر میں اور اس ملک میں کتنے لوگ ہیں جن کے متعلق دعویٰ کیا جا سکے کہ ان میں کوئی عیب نہیں ہے۔ تحقیق کریں تو چپڑاسی سے لے کر ملک کے صدر تک میں کوئی نہ کوئی عیب نکل آئے گا۔ لیکن ایک شخص اس "Q" سے باہر تنہا کھڑا ملے گا جس کے دامن پر کوئی معاشرتی' سیاسی اور اخلاقی داغ نہیں ملے گا اور اس کی روشن پیشانی پر جلی حروف میں "پیرزادہ احمد شاہ" لکھا ہوگا ----!

اگر یہ شخص مجھے انیسویں صدی میں ملتا اور میرا نام رحیم گل کی بجائے رحیم گل خان ہوتا تو میں بلا دریغ اس شخص کو اغوا کر کے وزیرستان پہنچا دیتا اور پورے قبائل کو جمع کر کے نذرانہ عقیدت کے طور پر انہیں شہید کر دیتا اور پھر ساری زندگی انکے مزار کا مجاور بن کر گزارتا ----!

لیکن یہ زار روس کی انیسویں صدی نہیں ہے۔ یہ الیگزینڈر سولژینٹسن کی بیسویں صدی ہے۔ اس سولژینٹسن کی' جو کینسر کا مریض تھا' جس نے نہ صرف کینسر جیسے موذی اور ناقابل علاج مرض کو شکست دی بلکہ سنگینوں کے ہالے میں اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا۔

میں اگر الگزینڈر سولژینٹسن کو روسی سماج کا ضمیر کہتا ہوں تو احمد ندیم قاسمی کو پاکستانی سماج کا ضمیر کہوں گا-------!

یہ نہ سمجھیے کہ دو متضاد نظریوں کے نمائندہ آدمیوں کو داد دے کر میں کنفیوژن پیدا کر رہا ہوں۔ بیشک راہیں الگ الگ ہو سکتی ہیں لیکن وہ سچ' جو انسانی ضمیر سے عبارت ہے' اس کے دو ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔

سچ تو سچ ہوتا ہے۔ وہ گنگا رام کے سینے میں ہو' یا ویلس متھائی کے سینے میں' اور یا دین محمد کے سینے میں' اس کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ کوئی نسل نہیں ہوتی' کوئی مذہب نہیں ہوتا ------ وہ باہر کی نہیں' اندر کی چیز ہوتی ہے۔!

یہ اندر کی چیز میں نے سولژینٹسن میں محسوس کی تھی۔ یہ اندر کی چیز میں نے احمد ندیم قاسمی کے سینے میں دیکھی ہے ------ یہ اندر کی چیز تھی جس نے سقراط کو زہر کا پیالہ دیا۔ یہ اندر کی چیز تھی جو سولژینٹسن کو وطن بدر کر گئی ---- یہ اندر کی چیز ہے' جو احمد ندیم قاسمی کی پیشانی پر ساٹھ سال سے جگمگا رہی ہے۔

تو دوستو ------ میں جو ایک سیدھا سادہ پٹھان ہوں۔ میں جو کسی ادبی گروہ کا آدمی نہیں ہوں ---- نہ "نقوش" کا' نہ "اوراق" کا' نہ "فنون" کا' اور نہ "سیپ" کا' میں ان سب کا آدمی نہیں ہوں' مگر میں ان سب کا آدمی ہوں ------ کیونکہ میرے پاس کوئی کسوٹی نہیں ہے کہ آپ کو بتاؤں ------!

میں کس سے کتنی نفرت کرتا ہوں' اور کس سے کتنی محبت کرتا ہوں ---- بات یہ ہے کہ جو نفرت کے قابل ہیں' میں تو ان سے بھی نفرت نہیں کرتا لیکن جو محبت کے قابل ہیں' ان سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہوں' میں جن سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہوں ان میں سے ایک نام احمد ندیم قاسمی کا ہے ------!

اگر یہ جانب داری ہے تو مجھے یہ الزام قبول ہے۔ اگر اس الزام کے تحت کوئی گروہ مجھے ادیبوں کی فہرست سے خارج کرتا ہے' تو مجھے یہ بھی منظور ہے' لیکن مجھے یہ منظور نہیں کہ کوئی مجھے ندیم صاحب کی محبت سے باز رکھے۔

یہ دور جو ایک دوسرے کو رد کرنے کا دور ہے' یہ صدی جو انتشار کی صدی ہے۔ اس میں اگر اتفاق سے مجھے دو چار آدمیوں کی محبت میسر آئی ہے تو میں ایسا بیوقوف کیوں بنوں گا کہ اس محبت کو کھو دوں گا۔

اگر اسرار زیدی کی طرح مجھے عارف عبدالمتین اچھا لگتا ہے' اگر عدم کے لئے میرے دل میں بے پناہ جذبات ہیں' اگر عطاالحق قاسمی میں مجھے قربت کا احساس ملتا ہے اور اگر خالد احمد جیسے فتنے سے بھی میں پیار کرتا ہوں تو اس میں میرا کوئی دوش نہیں دوستو ------ یہ تو اندر کی بات ہے ----!

اور بھی کچھ لوگ ہیں جنہیں میں پیار کرتا ہوں۔ لیکن فہرست طویل ہو جائے گی اور میں نفس مضمون سے ہٹ جاؤں گا۔

تو یہ طے ہوا ——— کہ ندیم صاحب میرے ہیں۔ اتنے زیادہ میرے، کہ شاید ناہید ندیم کے بھی نہ ہوں گے۔ نعمان ندیم کے بھی نہ ہوں گے۔ یہ معاملہ تو بس میں ہی جانتا ہوں۔ بے چارے ندیم صاحب کیا جانیں۔!؟

اس عقیدت و احترام کی بنیادیں بڑی ٹھوس اور گہری ہیں۔ دیوار چین کی طرح مضبوط، اسے کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اسے کوئی حملہ آور عبور نہیں کر سکتا۔

خدا واسطے کا پیار اپنی جگہ ——— کہ وہ اندر کی بات ہے۔ میں باہر کی باتیں بتا کر بھی ثابت کر دوں گا کہ جس نے ندیم صاحب کو نہیں پہچانا وہ شخص عرفان سے خالی ہے۔ اس عرفان سے خالی، جس سے پرندہ اپنے گھونسلے کی طرف لوٹتا ہے ——!

مجھے یاد ہے۔ آج سے ٹھیک تیس برس پہلے، جب میں نے داتا کی نگری میں قدم رکھا تھا تو نہایت سرشار دل لے کر آیا تھا۔ ان لوگوں کے لئے میرے دل میں ایک عجیب جذبہ موجزن تھا۔ جن کی کتابیں میں نے باجرے کے کھیت کے منڈیروں پر پڑھی تھیں۔ میرے معصوم دل اور کچے ذہن نے سوچا تھا، وہ کیسے کیسے لوگ ہوں گے جنہوں نے موتیے کی کلیوں کی طرح الفاظ چن چن کر شعر پروئے ہیں ——— کیسے کیسے خوبصورت لوگ ہوں گے، میں ان کے نیاز حاصل کروں گا ——— ان کی قربت کے احساس سے جھولیاں بھروں گا۔ موقع ملا، تو آنکھ بچا کر موتیے کی کلیاں چرا دوں گا۔ اور اپنے فن کا آنگن آباد کروں گا، لیکن اس شہر نا پرساں میں جہاں شاعروں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زیادہ ہے، مجھے وہ شاعر نہ ملا جس نے الفاظ کی کلیوں سے میرے ذہن و شعور کو معطر کر رکھا تھا۔ وہ ادیب بھی نہ ملا، جس نے میری روح میں محبت کے بھر بھر جام انڈیلے تھے۔

میں نے چند لوگ دیکھے۔ نفرتوں کے میلے پیرہن پہنے ہوئے، میکلوڈ روڈ کے چائے خانوں میں، ادبی حلقوں میں اور ٹی ہاؤسوں میں، جو میری طرح ناشتہ کرتے تھے، اور پلیٹ میں سب سے اچھی بوٹی پرندیوں کی طرح جھپٹتے تھے اور ایک دوسرے کی برائیاں کرتے تھے۔

یوں میرا شیشہ دل ٹوٹ گیا۔

وہ مافوق الفطرت شاعر اور ادیب کا تصور جو میرے کچے ذہن نے بنایا تھا، بکھر بکھر کر رہ گیا ——— اب مجھے خوف آنے لگا۔ وہ چند نام جو میرے سینے میں محفوظ تھے میں انہیں دیکھنے اور ملنے سے کترانے لگا۔ یہ اندیشہ کہ کہیں وہ بھی میری طرح گوشت پوست کے آدمی نکل آئے، تو میرا کیا بنے گا۔

اس فہرست میں سب سے پہلا نام ندیم صاحب کا تھا۔ پورے دو سال اپنے آپ پر جبر کئے رکھا۔ اور ان سے ملنے کے مواقع عمداً ضائع کرتا رہا۔

میرے دل میں ندیم صاحب کے لئے جو محبت اور احترام تھا، مجھے پسند نہیں تھا کہ اس میں ذرہ بھر کمی آئے۔ میں انہیں دوسرے لوگوں کی سطح پر دیکھنے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھا۔ آخر مجھے بھی تو کسی آسرے اور سہارے کی ضرورت تھی۔ میں اس احساس کو زندہ رکھنا چاہتا تھا کہ انسان کی ہستی محض نفرت سے عبارت نہیں ہے اور یہاں اگر محبتوں کی فراوانی نہیں ہے تو محبتوں کا یکسر فقدان بھی نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں کیکر کے تا حد نظر پھیلے ہوئے جنگل میں آم کے پیڑ کی تلاش جاری رکھتا ہوں۔ پیڑ ملے نہ ملے ——— کم از کم میرے تصور میں تو یہ پیڑ موجود ہے۔ زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے یہ تصور بہت تقویت پہنچاتا ہے۔

آخر ایک دن منیر نیازی کھینچے کھینچے مجھے میکلوڈ روڈ سے ہسپتال روڈ کی طرف یہ کہہ کر لے گیا ——— "کہ آج تم ایک خوبصورت آدمی سے ملاقات کرو گے ——!"

میں نے کہا ——— "تم کم خوبصورت ہو کیا ———؟"

بولے ——— "وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے ———!"

یوں ہم دفتر "امروز" کی سیڑھیاں طے کر کے ایک چھوٹے کمرے میں پہنچ گئے، میں نے چونک کر دیکھا ——— یہ تو وہی شخص تھا جس کی تصویر میں نے سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں دیکھی تھی اور جس کے چہرے سے شرافت اور آنکھوں سے طہارت چھلکتی تھی۔

منیر نے تعارف کرایا ——— "یہ ہیں ندیم صاحب، اور یہ ہے رحیم گل!"

ندیم صاحب نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملا کر کہا ——— "ہاں میں انہیں جانتا ہوں!"

میں چونکا ——— یعنی یہ شخص مجھے جانتا ہے! ——— یقین کرو دوستو، میں بالکل بدحواس ہو گیا، مجھ جیسے بے نام گم نام آدمی کو ندیم صاحب جانتے ہیں!۔ یہ حیرت کی بات تھی واقعی میں اس وقت کچھ نہیں تھا۔ اب بھی کیا ہوں۔ مگر آج سے اکیس برس پہلے کون جانتا تھا مجھے۔!

مگر ندیم صاحب مجھے جانتے تھے ---- دراصل لاہور میں یہ میری پہلی پہچان تھی۔ میں نے کیکر کے جنگل میں آم کا پیڑ پا لیا تھا۔ مجھے وہ شاعر بھی مل گیا ' جسے میں نے تصور کے ریشمی غلاف میں چھپا رکھا تھا۔

اب حقیقت میرے سامنے تھی۔ وہ ایک مافوق الفطرت وجود بن کر مجھ سے مخاطب تھا۔ اور میں خوش تھا کہ مجھ پر عظمت انسانی کا ایک عقدہ وا ہو گیا تھا۔

تب مجھے قرآن کی وہ بات یاد آ گئی کہ انسان زمین پر خدا کا نائب ہے۔ یقیناً دنیا کے وہ نائب مجھ جیسے لوگ نہیں' ندیم صاحب جیسے لوگ ہوتے ہیں۔

منیر نیازی باتیں کر رہا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ "ہاں میں انہیں جانتا ہوں!"

اس چھوٹے سے جملے میں کیا بھید تھا کہ میری روح کھل اٹھی تھی۔

دراصل اس فقرے کے بطون میں ایک عظیم آدمی کی پہچان کی خوشبو رچی بسی تھی۔ وہ دن اور یہ دن' میں نے ندیم صاحب پر کبھی شک نہیں کیا ---- ان کی اس ادا سے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کا گرویدہ بلکہ غلام بن گیا تھا۔

ندیم صاحب جب سے سمن آباد منتقل ہوئے ہیں۔ باقاعدگی سے عید ملنے جاتا ہوں۔ گزشتہ سے گزشتہ عید کا ذکر ہے' نماز عید کے بعد گھر واپس آیا۔ بچوں سے ملا اور ندیم صاحب سے عید ملنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا بڑا بیٹا عدیم عادل' جس کی عمر تقریباً گیارہ برس ہے بولا ------ "ابو آپ کہاں جا رہے ہیں ------؟"

میں نے کہا ------ "ندیم صاحب کے پاس"

کہنے لگا ---- "وہی نا۔ جو ٹی وی پر کبھی کبھی آتے ہیں۔؟"

میں نے کہا ---- "ہاں وہی"

کہنے لگا ---- "میں بھی ان سے ملوں گا"

میں نے کہا ---- "یہ تو ثواب کا کام ہے۔ چلو"

عید ملنے کے بعد واپس آنے لگے تو ندیم صاحب نے عدیم عادل کو دس روپے عیدی پکڑا دی۔

میں نے راستے میں عدیم عادل سے پوچھا ---- "تم ندیم صاحب کو دیکھنے گئے تھے یا عیدی لینے گئے تھے؟"

وہ شرمندہ و مجوب پلکیں جھپکا جھپکا کر مجھے دیکھنے لگا۔

اب کے عید آئی۔ میں ندیم صاحب سے ملنے کے لئے تیار ہو گیا۔ عادل سے پوچھا "کیوں بھئی" ندیم صاحب سے عید ملنے نہیں جاؤ گے؟" لڑکے نے ذو معنی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اور مسکرا کر بولا۔ "نہیں وہ مجھے پھر عیدی پکڑا دیں گے!"

تو دوستو ---- کیا کیا جائے۔ کہ بچے جو ان سے بڑوں کی طرح پیار کرتے ہیں' ندیم صاحب انہیں مٹھائی کھلا کر ناراض کر دیتے ہیں۔ ان کی اس عادت سے بعض بڑے لوگوں کو بھی شکایت ہے کہ وہ ہر آدمی کے ساتھ اتنا میٹھا سلوک کیوں کرتے ہیں کہ رقابت دب جاتی ہے اور احترام سامنے آجاتا ہے ----؟

کیا بتاؤں ---- ایں سعادت بزورِ بازو نیست۔

دوستوں اور غیروں سے ان کے شریفانہ رویے کی ایک مثال اور سنیئے۔

نام یاد نہیں' کئی برس ادھر کی بات ہے۔ ایک عرب ادیب پاکستان آیا تھا۔ ان کے اعزاز میں کئی تقاریب بھی ہوئی تھیں۔ اگرچہ میں کسی تقریب میں شرکت نہیں کر سکا تھا لیکن اخباروں میں خبریں پڑھتا رہا۔ اس سلسلے میں روزنامہ "مشرق" میں جناب انتظار حسین کا کالم پڑھا تو مجھے یہ عرب ادیب مسخرہ لگا۔ لیکن دوسرے ہفتے روزنامہ "جنگ" میں ندیم صاحب کا کالم پڑھا تو یہ عرب ادیب مجھے واقعی دانشور لگا۔

تب معلوم ہوا۔ کہ حقیقتیں کس طرح افسانے بن جاتے ہیں۔!

اور تب یہ راز بھی کھلا کہ جو لوگ دوسروں کو احترام دیتے ہیں' دراصل خود ہی محترم ہوتے ہیں ------!

ایک بات اور بتاؤں ---- یہ وہ دور ہے کہ اگر آپ میری تعریف کریں' تو مجھے حیرت کے ساتھ آپ کا اپریشن کرنا پڑے گا تاکہ آپ کا دل گردہ دیکھ کر اندازہ کر سکوں کہ اس کا وزن اور حجم کتنا ہے۔ کیونکہ عام ہوا یہ ہے کہ آج کل دل گردے سکڑ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کسی کو نہیں مانتا۔ کسی کی عظمت تسلیم نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی بھولا بھالا شخص کسی کو تسلیم کر لے تو ظاہر ہے' آپ اس کا دل گردہ دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔

تو بتا دوں۔ ایک بھولا بھالا شخص اس پرفریب دنیا میں موجود ہے بلکہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ ندیم صاحب ہیں۔

میرا دوسرا ناول "پیاس کا دریا" مکمل ہوا۔ دیباچے کے لئے میں

نے دو چار مشہور ادیبوں سے رابطہ پیدا کیا۔ انہوں نے اس کی حامی بھی بھری۔ سال چھ مہینے مسودہ بھی رکھا لیکن دیباچہ نہ لکھا گیا۔ میں اس قسم کے سلوک کی توقع کم از کم ان شرفا سے نہیں رکھتا تھا۔ اور وہ بھی غالباً مجھ سے یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ ان کے رویے سے میں کسی طرح کا رد عمل ظاہر کروں گا۔

اب صرف ندیم صاحب ہی تھے کہ دیباچے کے لئے ان سے رجوع کرتا۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی' کہ ندیم صاحب سے مجھے بے پناہ عقیدت تھی بے پناہ محبت تھی۔ میں ڈر رہا تھا کہ اگر انہوں نے بھی دوسرے دوستوں کی طرح ٹال مٹول سے کام لیا تو میرا کیا بنے گا۔ میں اپنی عقیدت کا جنازہ کہاں کہاں اٹھائے پھروں گا' ظاہر ہے کہ میں بکھر جاؤں گا۔ ٹوٹ ٹوٹ جاؤں گا ـــــ!

لہٰذا یہ ندیم صاحب سے میری انتہائے محبت تھی کہ ان کی طرف نہ گیا۔ لیکن عرض مصنف کے کھاتے میں جہاں میں نے ان شرفاء کے سلوک کا ذکر کیا وہاں ادیبانہ تعلی کا شعار ہو کر' یوں کہیئے کہ انتقاماً اپنے ناول کی خود تعریف کی۔ تعریف بھی یہاں تک کہ جس موضوع پر میں نے ناول لکھا ہے اسے جناب میرزا ادیب نہ لکھ سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ندیم صاحب بھی اس موضوع پر مجھ سے اچھا نہ لکھ سکتے۔ بلکہ ایسا ناول لکھنا میرا ہی مقدر تھا ـــــ!

کچھ لوگوں نے اس غلط بینی یا خود بینی پر مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ کہ کم از کم مجھے ندیم صاحب کے خلاف زہر نہیں اگلنا چاہیئے تھا۔ لیکن میری ڈھٹائی اور دیدہ دلیری دیکھیئے کہ جب اس ناول کی تقریب کا اہتمام ہوا تو میں نے صدارت کے لئے ندیم صاحب کا نام لیا۔ سب لوگ چونکے ـــــ مگر میں جانتا تھا ـــــ میں ندیم صاحب کی عالی ظرفی کو ان سے زیادہ جانتا تھا۔

ندیم صاحب نے اس تقریب کی صدارت قبول کی۔ انہوں نے صدارتی خطبے میں جو کچھ کہا۔ یار لوگ اسے سن کر دنگ رہ گئے۔ انہوں نے کہا ـــــ

"یہ ناول پڑھ کر میں ذہنی طور پر پہلے سے زیادہ امیر ہو گیا ہوں۔ یہ رحیم گل کے کہانی کہنے کا کمال ہے کہ میں چار سو صفحہ کے اس طویل ناول کو ایک نشست میں پڑھنے پر مجبور ہو گیا اور رحیم گل کا یہ دعویٰ سچ ہے کہ ایسا ناول لکھنا کسی اور کا نہیں' رحیم گل کا مقدر تھا۔"

تو دوستو ـــــ یہ ہیں ندیم صاحب۔ جو لوگ بڑے لوگوں کو پہچاننے میں بخل سے کام لیتے ہیں وہ تعصب کی عینک اتار کر اس پہچان کی آنکھوں سے دیکھیں تاکہ انہیں ندیم صاحب کا بے مثال روپ نظر آئے ـــــ!

ان کے دل گردے کی ایک بات اور سن لیجئے ـــــ پچھلے دنوں میں نے اپنا ایک ناول مکمل کیا۔ "جنت کی تلاش" اس کا موضوع ایسا تھا کہ مجھے پاکستان کے گوشے گوشے کی سیاحت کرنا پڑی۔ اس ناول کو لکھنے میں چھ سال لگے۔ ظاہر ہے' بہت محنت طلب اور صبر آزما کام تھا یہ۔

اب کے میں نے طے کر لیا تھا کہ دیباچہ ندیم صاحب سے لکھواؤں گا حالانکہ انہی دنوں ایک اخبار میں خبر چھپی تھی کہ کثرت دیباچہ نویسی سے بار کر ندیم صاحب انتقال کر گئے ہیں! لیکن مجھے معلوم تھا کہ ندیم صاحب تو ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور پھر سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں نے جس ذوق و شوق سے یہ ناول لکھا تھا جتنے بڑے موضوع کو زیر بحث لایا تھا اس کی تنقید و تبصرہ کے لئے بھی کسی بڑے دل گردے کے ادیب کی ضرورت تھی کیونکہ کسی کے حق کو تسلیم کرنا' کسی کو جائز داد دینا نہایت حوصلے کا کام ہے' خصوصاً اس دور میں کسی کے لئے کلمہ خیر کہنا آسمان سے تارے توڑنے کے مترادف ہے۔

لیکن میں جانتا تھا کہ اس ملک میں خدا کا ایک بندہ موجود ہے جس کے منہ میں سچ کی زبان ہے' جس کے فراخ سینے میں حوصلے کا پہاڑ کھڑا ہے اور جس کے قلم سے روشنائی کی بجائے موتی ٹپکتے ہیں۔

جب میں نے اس ضخیم ناول کا مسودہ ندیم صاحب کے حوالے کیا تو وہ ہنس پڑے۔ ان کی خوبصورت ہنسی سے میری چھ سال کی محنت سپھل ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا ندیم صاحب نے کسی سے کہا۔ "جنت کی تلاش" ایسا ناول ہے جس کا دیباچہ میں رسمی طور پر نہیں لکھوں گا بلکہ قارئین کو اپنے ایک لطیف تجربے میں شریک کروں گا!"

تقریباً سال سوا سال کے بعد جب ندیم صاحب نے دیباچہ میرے حوالے کیا' میں نے دیکھا' ندیم صاحب کا کہا ہوا فقرہ دیباچے میں درج تھا۔ میں سامعین کو اپنی مسرت میں شریک کرتے ہوئے اور ندیم صاحب کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے اس دیباچے کا شروع اور آخر کا مختصر سا اقتباس سناتا ہوں۔

"جنت کی تلاش" اردو زبان کا پہلا ناول ہے جس میں وہ گہری اور گمبھیر الجھنیں موضوع بنی ہیں جنہوں نے صدیوں سے بڑے بڑے حکیموں' فلسفیوں' داناؤں اور دانشوروں کو جستجوئے مسلسل میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس بہت بڑے اور پھیلے ہوئے موضوع کو رحیم گل نے ایک

ماسٹر کرافٹسمین کی طرح شروع سے آخر تک اپنی پر اعتماد گرفت میں رکھا ہے اور ایک ایسا ناول تخلیق کیا ہے جو اپنے موضوع اور نوعیت اور بنت کے لحاظ سے کم از کم اردو زبان میں تو بے مثال قرار دیا جا سکتا ہے ------!"

آخر میں وہ لکھتے ہیں ----

"مجھے یقین ہے کہ اگر اہل نقد نے دیانت سے کام لیا تو وہ جنت کی تلاش کو ایک ایسا ناول تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جو اپنے موضوع اور برتاؤ کے لحاظ سے منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ اور جو مستقبل کی اردو ناول نگاری کی ایک مضبوط بنیاد قرار پا سکتا ہے!"

تو دوستو ---- یہ ہے وہ حوصلہ مند شخص، جسے شاید معلوم نہیں کہ میرے ناول "جنت کی تلاش" کا ایک کردار سکرو کا ڈاکٹر، در حقیقت ندیم صاحب کا کردار ہے۔ وہ چلتا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاؤں میں سپرنگ لگے ہوئے ہیں اور دیکھتے دیکھتے آسمان کی طرف پرواز کر جائے گا ------ زندگی سے اس کا سلوک، انسانوں سے اس کا برتاؤ اور بیوی سے اس کا سمبندھ ساری خصوصیتیں میں نے ندیم صاحب سے چرا کر اپنے کردار کو ودیعت کر دی ہیں۔

اگرچہ کردار ناول کے آخری باب میں انٹر ہوتا ہے مگر ناول کے تمام کرداروں کو متاثر کرتا ہے۔ بالکل اس طرح، جیسے ندیم صاحب نے اپنے ادبی اور شخصی کردار سے ایک عالم کو متاثر کیا ہے۔

سامعین کرام ----- مضمون ختم کرنے سے پہلے میں اپنی آخری خواہش کا اظہار کر دوں کہ جب ندیم صاحب کی 75 ویں سالگرہ منائی جا رہی ہو تو میں ایک بار پھر مضمون پڑھوں۔ اور جب ندیم صاحب اپنی بے مثال زندگی کے ایک سو ایک سال پورے کر لیں تو میرا وہ بیٹا جو ان کی محبتوں سے خوفزدہ ہے، باپ کی جگہ اسٹیج پر آ کر اس عیدی کا ذکر اس انداز میں کرے کہ محبت کا خوف، جوان ہو کر کس طرح، محبت کی انتہا میں بدل جاتا ہے۔ اور نسل در نسل کس طرح محبت کا چراغ روشن رہتا ہے۔

انعام الحق جاوید کی غزل میں اس مقامی لہجے کا بھرپور حسن موجود ہے جسے آئندہ پاکستان میں کہی جانے والی اردو غزل کی کسوٹی بننا ہے۔ (احمد ندیم قاسمی)

انعام یافتہ مصنف ڈاکٹر انعام الحق جاوید
کی سنجیدہ شاعری کا مجموعہ
ساتویں سمت

ہر لفظ کو کاغذ پہ اتارا نہیں جاتا
ہر نام سرِ عام پکارا نہیں جاتا
ہوتی ہیں محبت میں کئی ذاتی باتیں
ویسے ہی تو اس کھیل میں ہارا نہیں جاتا

کمپیوٹرائزڈ کتابت، آفسٹ پرنٹنگ، ہفت رنگ سرورق اور منفرد گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ صفحات ۱۶۰ قیمت ۱۰۰ روپے

ممتاز مزاح نگار، معتبر نقاد، صاحب نظر محقق اور کالم نویس اب نئی سج دھج کے ساتھ سنجیدہ شاعری کی یہ سوغات لے کر آیا ہے۔ جو اس کی تخلیقی سوچ کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ (افتخار عارف)

انعام الحق جاوید سید ضمیر جعفری اور انور مسعود کے بعد ہمارے عہد کا تیسرا بڑا شاعر ہے جس نے ہر دو میدانوں میں یکساں طور پر کامیابی حاصل کی ہے۔ (امجد اسلام امجد)

تقسیم کار :- تخلیقات، اکرم آرکیڈ، ۲۹ ٹمپل روڈ لاہور: فون: ۷۲۳۸۰۱۴
ناشر :- مکتبۂ فانوس ۶۹۷، اسٹریٹ ۹۲- ۹/۴ جی، اسلام آباد: ۸۵۱۴۲۵

ہمارے عہد کا تنہا حسابِ دانِ جمال

محسن احسان

احمد ندیم قاسمی اس عہد کا ایک قد آور، متحرک اور ارتقا پذیر تخلیق کار ہے۔ اس کے قلم نے نہ کبھی رکنا سیکھا ہے نہ جھکنا۔ وہ ہمارے دور کا وہ تنہا حساب دانِ جمال ہے جو حسن کو سینکڑوں رخوں سے دیکھتا ہے اور اسے اپنے رگ و پے میں رواں دواں محسوس کرتا ہے۔ جو گردش سیارگاں کو ہزاروں انداز سے پڑھتا اور سمجھتا ہے اور اسے اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ کر دیتا ہے۔ جو حیات و کائنات کے رنگ و آہنگ کو جگنوؤں کی طرح اپنی مٹھی میں بند کر لیتا ہے۔ جو مژہ ہائے دارز کو اپنے دل کی تہوں میں اتار کر حدیث لب شعلہ وشاں کی لاکھوں مثالیں چن کر بھی تھکن سے دو چار نہیں ہوتا۔ جس کے فن نے کسی منصب و مقام کے آگے سپر انداز ہونا نہیں سیکھا بلکہ یہ دیارِ محبت کی بچی بارگاہوں سے ہوتا ہوا، زندگی کے عموی پہلوؤں سے ساز باز کرتا ہوا اور مخالفتوں کے سمندر سے گزرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا رہا ہے۔ یہ ہمہ رنگ ہے۔ ہمہ خوشبو ہے۔ یہ جلوۂ دلنواز بھی ہے اور نغمۂ جاں گداز بھی۔ اس میں صدائے تیشہ بھی ہے اور شکست کوہسار بھی۔ یہ ہر دور پر محیط اور ہر عہد کے جذبے کی زبان ہے۔ اس میں فکر و تعقل جذبے کی رعنائیوں سے رنگین دکھائی دیتے ہیں اور جذبہ و احساس حکمت و فلسفہ سے مست و سرشار نظر آتے ہیں۔ ندیم کی ساری تخلیقاتِ فن میں ایک مجسم درد مندی کا شدید احساس ہے۔ ایک غیر مفتوح عجز ہے جو بیکراں ہوتا ہی چلا جاتا ہے اور ایک سر بلند عظمت ہے جو درد و غم میں ڈوب کر روح کی پکار بن گئی ہے۔ اس کے کلام میں وہ تمام موثر اور حسن افروز عناصر یکجا ہوتے ہیں جو اردو شاعری کے روایتی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ نئے اندازِ فکر اور جدید اسلوب بیان کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ ندیم کی تخلیقی توانائی اور فکری انفرادیت کا اظہار شاعری، افسانے، ڈرامے، تنقید اور اخباری کالموں میں ہوا ہے۔ اور یہ ساری اصناف ادب اس کے تخلیقی سفر کے پڑاؤ نہیں بلکہ پیرائے ہیں۔ ادب کو زندگی کے حوالے سے اور زندگی کو ادب کے نقطۂ نظر سے سمجھنے اور سمجھانے کے اسلوب ہیں۔ ندیم نے اپنی تخلیقی اظہار میں زندگی کی گہرائی و گیرائی اور کائنات کی وسعت و تنوع کو سمیٹنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس کا سارا فن اس کی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ ہر دور میں اس کے افکار و اظہار کے آہنگ و اسلوب کا ارتقا اور اس کا بھرپور، معتدل، متوازن اور باوقار لب و لہجہ اس امر کی دلیل ہے کہ اس نے تخلیقی سفر میں نہ تو تھکن محسوس کی ہے اور نہ ہی اس کی پیشانی پر خوف و سراسیمگی کے آثار نمایاں ہوئے ہیں۔ یہ سب شاید اس لئے کہ ندیم انداز جراحت کو شہپارہ فن کی طرح دل میں محفوظ رکھنے کا ہنر جانتا ہے اور قوت تخلیق کو اکسانے کے لئے ضمیر ارتقا میں بجلیاں دوڑانے کے فن سے بخوبی آشنا ہے۔ اس کا یہ سارا تخلیقی عمل اس کی فکری، فنی اور کائناتی ارتقا کی حیثیت کو مربوط کرتا ہے اور وہ پکار اٹھتا ہے کہ ۔

میں مر بھی جاؤں تو تخلیق سے نہ باز آؤں
بنیں گے نت نئے خاکے مرے غبار سے بھی

شعر کیا شعاعیں چنتا ہے
شاعری نورِ جاودانِ جمال
خشک لب میرے، چھلنی پاؤں مرے
اور لقب ہے مزاجدانِ جمال

"لوحِ خاک" ندیم کی اب تک کی فنی ریاضت کا وہ آخری مجموعہ کلام ہے

جس میں اس نے فکر اور فن کے ملاپ سے ایک نئی جہت کی نمود مکمل کی ہے۔ اس میں ندیم نے لفظوں کی ظلمت سے نور کشید کیا ہے۔ اس کی آواز اب رنگ، نسل، مذہب، عقاید، مشرق، مغرب، شمال، جنوب کی بندشوں سے نکل کر ساری انسانیت کی ایک دکھی مگر حوصلہ مند آواز بن گئی ہے۔ وہ ایک ایسا تشنہ لب مسافر ہے جس کے جسم پر قرنہا قرن کی گرد اور مجروح اعضا پر مسافتوں کی ردا لپٹی ہوئی ہے۔ وہ ہواؤں کا نبض شناس بھی نظر آتا ہے اور بگولوں کا ہمسفر بھی۔ وہ مذہبی منافرت، نسلی مناقشت، طبقاتی منافقت اور گروہی تعصبات سے بالا تر ہو کر تہذیبی توانائیوں کے آئینوں کو صیقل کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی نظم "درد" ذات و کائنات کے درمیان مسلسل رابطوں کا وہ تخلیقی اظہار ہے جس میں آدمی ذات کی گہرائیوں سے نکل کر کائنات کی ہمہ گیر وسعتوں میں ڈوب ڈوب جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے ۔

وجود---- احساسِ درد میں ہے
اگر یہ احساس ہی نہ ہو----تو
وجود اپنے عدم کے گہرے میں ڈوب کر
بے وجود ہو جائے
درد عرفانِ ذات ہے
کائنات کو درد ہی نے چھانا ہے
درد ہی زہرہ و زحل تک رسائی ہے
اور خدائی بھی نورِ درد سے ستیز ہے
اس کی تابشوں سے
حیات اور پھر حیات سے ماورا کے سب ممکنات روشن میں
درد ہے تو جہاں بھی ہے
اور آدمی بیکراں بھی ہے

ندیم کے نزدیک آدمی کو بیکراں بنانے والا درد بھی فطرت انسانی کو فنا آلود نہیں ہونے دیتا۔ یہ تو فطرت کی تجلیوں کا مظہر بن جاتا ہے۔ ندیم روشنیوں اور رنگوں سے بھرپور کائنات اور خوشبوؤں اور نکہتوں سے مہکی دہکتی فضاؤں میں زندگی کی کلی کو ہنستا دیکھ کر ان لوگوں کے رویے کو قابل تاسف گرداتا ہے جو زندگی جیسی خوبصورت نعمت کو ڈر ڈر کر بسر کرتے ہیں۔ زندگی ندیم کے لئے "رنگ و بو کا صحیفہ" ہے جس کے مطالعے کے لئے "چشم محبت" کی ضرورت ہے۔ اس کی نظم "ڈر" اسی جذبے کا خوبصورت اظہار ہے ۔

ہم بھی کیا لوگ ہیں
جو زیست کی نعمت کو بھی
ڈر ڈر کے بسر کرتے ہیں
ہم یہ کہتے ہیں
کہ جو پھول کھلا ہے اسے مرجھانا ہے
لیکن اس پھول کو کھلنے کی تو کچھ داد ملے
اس کا یہ عزم تو دیکھو
کہ وہ اس علم کے باوصف کھلا ہے
کہ بالآخر اسے مرجھانا ہے
رنگ و بو کا یہ صحیفہ ہے
اسے ڈر سے نہیں---- چشم محبت سے پڑھو
اور ڈرنا ہی ضروری ہے
تو پھر مردنیٔ حس لطافت سے ڈرو

یہی مردنیٔ حس لطافت، انسان کو زندگی اور زندگی کی تمام تر رعنائیوں اور لطافتوں سے محروم کر دیتی ہے۔ ندیم کا گہرا مشاہدہ جب پیکر شعر میں ڈھلتا ہے تو وہ قدیم و جدید کے دلکش امتزاج سے تجربے کی سچائی کو چھو لیتا ہے۔ اور یوں وہ اپنے عہد کے تاریخی شعور کا حساب دان اور اپنے دور کی فکری شکستگی کا نوحہ خواں بن جاتا ہے:

طوفاں ہے اگر گھر کے در پے، یوں بیٹھ نہ جاؤ، کچھ تو کرو
کھڑکی کے شکستہ شیشے پر کاغذ ہی لگاؤ، کچھ تو کرو
انسان کے قبضۂ قدرت میں اک نطق نہیں ہے، بہت کچھ ہے
ہونٹوں سے نہ نکلے بات اگر، آنکھوں سے سناؤ، کچھ تو کرو
سلطان کے قصرِ مرمر کا دروازہ آہن بند سہی
گر توڑ نہیں سکتے اس کو، زنجیر ہلاؤ، کچھ تو کرو
یہ کھیت جو چپ ہیں، بولیں گے اور اکھوے آنکھیں کھولیں گے
بارش نہ سہی بجلی ہی سہی، کچھ تو برساؤ، کچھ تو کرو

ندیم اپنی ذات میں کائنات ہے اور وہ کائنات میں اپنی ذات کے حوالے سے جگمگاہٹیں پھیلانے کا آرزو مند ہے۔ وہ ہفت افلاک کی سمت التجا بھری نگاہیں اٹھا کر دیکھنے کی بجائے اپنے اندر کے کرب آمیز کی شعاعوں سے کائنات کو تابندہ و درخشندہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ زمین کے باسیوں کو آسمانوں سے بھی آگے حد امکان رسائی پھیلانے کا درس دیتا ہے ۔

آسمانوں کی طرف مت دیکھو

آسمانوں میں تو اتنی سی حقیقت بھی نہیں
کہ کسی لمس کو ممنون کریں
اور انسان جسے چھو نہیں سکتے
اسے تسلیم کہاں کرتے ہیں
آسمانوں سے پرے ہے حدِ امکانِ رسائی ان کی
آسماں کچھ بھی نہیں
وہ حقیقت میں بصارت کی رسائی کے افق ہیں
وہ خلاؤں کے عمق ہیں
وہ بلاوا ہیں
مگر صرف بلاوا ہیں
فقط گونج ہیں
اور گونج فقط عکس ہے آوازوں کا
آسمانوں کی طرف مت دیکھو
تم زمیں پر ہو تو اس تک حدِ امکانِ رسائی پھیلاؤ
اس کی مخلوق کو دیکھو کہ جو چہروں میں، دماغوں میں، دلوں اور
ضمیروں میں کئی رنگ کے افلاک لئے پھرتی ہے
انہی افلاک کے چھونے کا کوئی چارہ کرو
اپنی بھرپور توانائی کو
آسمانوں کے سرابوں میں نہ آوارہ کرو

تمام دنیا میں دو عظیم جنگوں کے بعد یہ احساس بڑی شدت سے عام ہوا کہ انسان زوال کے ایک مسلسل تجربے سے گزر رہا ہے۔ اس کی عظمت سرنگوں اور اس کی عقلیت اخلاق سے عاری ہے۔ اس کی قوت، خیر سے محرومی کے سبب خود اس کے لئے عذاب بن گئی ہے۔ لارنس کا خیال تھا کہ عقلیت زدہ معاشرے میں مشینوں کی برتری کے احساس نے انسانوں کو ایک نئی دیوانگی میں مبتلا کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی تہذیب بد وضع اور اس کی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی ہے، اور ادھوری حقیقتوں کے غلبے نے اس کے اندر نیکیوں کو روند دیا ہے۔ ندیم جوہری جنگ کے خوفناک امکان کے تناظر میں اکیسویں صدی کو جب اپنے ضمیر کے آئینے میں دیکھتا ہے تو اس کی آواز میں عصر جدید کا سارا کرب سمٹ آتا ہے ۔

مری صدا پر گرفتِ شب ہے
میں پوری شدت سے چیخ کر بھی
سنائی دیتا نہیں کسی کو
مری بصارت کو تیرگی جذب کر رہی ہے
کہ ہر طرف دیکھنے کی خواہش میں
میں نے آنکھوں کی پتلیاں توڑ پھوڑ دی ہیں
مری سماعت سکوت کی ایک گونج ہے
اور مرا دماغ ایک کوششِ رائیگاں ہے ریشم کے
الجھے گچھے کو کھولنے کی
کہ میں نے اکیسویں صدی کو
ضمیر کے آئینے میں دیکھا ہے
اور انسان کو
کچھ ایسا نڈھال پایا ہے
جیسے سرسبز پیڑ کی شاخ
تیز جھونکوں کی زد میں آکر
لٹک پڑی ہو

ندیم نے اپنی نظموں میں روح عصر کو سمونے کا ایسا قدرتی فطری طریقہ اپنایا ہے جس پر تصنع یا آورد کی چھاپ نہیں۔ وہ عصر حاضر کے تضادات اور ان کے باہمی تصادم سے دوچار ہے۔ اس کی نظم "فاتحین بیروت سے" انہی تضادات کا شدید اظہار ہے کہ وہ عصر جدید کی سفاکیوں اور بلاکتوں کو دیکھ کر مدعیان تہذیب و ثقافت سے کیسا پختہ ہوا سوال کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ۔

تمہارے اوجِ تہذیب و ثقافت کا
زمانہ معترف ہے
اور میں بھی معترف ہوں
صرف یہ ننھا سا شکوہ ہے
کہ تم بے خانمانوں کے کلیجوں میں اترتی برچھیوں کو تو عجائب گھر میں
فنکارانہ اندازِ تناسب سے سجاتے ہو
مگر چھلنی کلیجے بھول جاتے ہو

ندیم کے اس ننھے سے شکوے نے مہذب معاشرے کے علمبرداروں کی جس طرح قلعی کھولی ہے اور اخلاق و اقدار کے ان خداؤں کو جس طرح ہدف تیر ملامت بنایا ہے وہ ندیم کے دھیمے مگر طنزیہ لہجے کا نقطہ کمال ہے۔ اس نظم پر سرگوشی یا خود کلامی کا گماں گزرتا ہے۔ یہ قاری کو ساتھ بہالے جانے کی قوت بھی رکھتی ہے اور داخلی درد اور اندرونی سوز سے معمور بھی ہے۔ اس میں انسان کے اندر مسلسل سلگتے رہنے کی کیفیت بھی موجود ہے۔

نظم "لذتِ آگہی" میں آگہی ندیم کی شناخت بھی ہے اس کا لطف بھی ہے اور کرب بھی۔ اس نظم کی فضا میں زیرِ لبی کی کیفیت عجب حسن پیدا کرتی ہے اس میں جذبہ کہیں بھی شوریدہ نظر نہیں آتا بلکہ اس کے برعکس جذبے کی تمام کیفیتیں پوری شدت کے ساتھ اس میں گھل سی گئی ہیں اور شاعر ان کیفیتوں کو تخلیقی کرب کے ساتھ اپنے وجود میں محسوس کرتا ہے۔ یہ نظم نئے معانی کو زیرِ سطح جنم دیتی ہے اور قاری پر ایک نئی حقیقت کا انکشاف کر کے اسے جمالیاتی حظ فراہم کرتی ہے ۔

میں عجیب لذتِ آگہی سے دوچار ہوں
یہی آگہی مرا لطف ہے' مرا کرب ہے
کہ میں جانتا ہوں
میں جانتا ہوں کہ دل میں جتنی صداقتیں ہیں
وہ تیر ہیں
جو چلیں تو نغمہ سنائی دے
جو ہدف پہ جا کے لگیں تو کچھ بھی نہ بچ سکے
کہ صداقتوں کی نفی ہماری حیات ہے
مرے دل میں ایسی حقیقتوں نے پناہ لی ہے
کہ جن پہ ایک نگاہ ڈالنا
سورجوں کو بطونِ جاں میں اتارنا ہے!
میں جانتا ہوں
کہ حاکموں کا جو حکم ہے
وہ دراصل عدل کا خوف ہے
وہ سزائیں دیتے ہیں
اور نہیں جانتے
کہ جتنی سزائیں ہیں
وہ ستمگری کی ردائیں ہیں
مجھے علم ہے
یہی علم میرا سرور ہے
یہی علم میرا عذاب ہے
یہی علم میرا نشہ ہے
اور مجھے علم ہے
کہ جو زہر ہے
وہ نشے کا دوسرا نام ہے
میں عجیب لذتِ آگہی سے دوچار ہوں

ندیم کو جو لذتِ آگہی نظم کے تخلیقی سفر میں اکائیوں کی صورت میں ملی' غزل میں وہ اجتماعی کیفیتوں کی صورت میں میسر آئی۔ وہ ہر شعر کے پیکر میں خیال کی روح کچھ اس طرح سموتا ہے کہ جذبہ لو دے اٹھتا ہے۔ اس کے کلام میں حسن و عشق کے جذبات و احساسات سے لے کر سیاسی اور نفسیاتی الجھنوں تک کے نئے نئے پہلوؤں کا ابلاغ انسانی ذہن کے لئے مستقل جمالیاتی حظ کا ذریعہ بنتا ہے۔

یہ اشعار سنئے ۔

مجھے دکھ یہ ہے کہ بہار میں بھی طیور بے پر و بال ہیں
مرے ہم سفر نہ ملول ہوں' یہ ملال میرے ملال ہیں

یہ عجیب حسنِ قیاس ہے کہ جو دور ہے وہی پاس ہے
یہ تصورات کے واہمے مرے دشتِ غم کے غزال ہیں

خود کو آئینے میں دیکھا تو میں مانندِ چراغ
اپنے ہی ہاتھ پہ رکھے ہوئے سر اپنا تھا

شفق غبار بنی اور کوچ کرنے لگی
جبینِ وقت پہ گردِ سفر اترنے لگی

وہ جیسے جنس زدوں کے مزار ڈھونڈتی ہے
قدم قدم پہ نگارِ صبا ٹھہرنے لگی

وہی تاجر ہیں سر افراز جو اس منڈی میں
نقدِ ایماں کے عوض لقمۂ تر تک پہنچے

شہراہِ شب پہ راہنماؤں کی بھیڑ تھی
ہر ہاتھ میں چراغ تھا لیکن بجھا ہوا

عجب صدی ہے کہ بے چہرہ ہو گئی مخلوق
مجھے کسی کے بھی شانوں پہ سر نہیں ملتا

سرِ گلزار لئے بیٹھے ہیں چھلنی تلوے
ہم جو کلیوں پہ کبھی پاؤں نہ دھرنا چاہیں

احمد ندیم قاسمی اپنے
بردار بزرگ
ایم بی پیرزادہ کے ساتھ

لوگ اشیا کی طرح بک گئے اشیا کے لئے
سرِ بازار تماشے نظر آئے کیا کیا

میں کشتی میں اکیلا تو نہیں ہوں
مرے ہمراہ دریا جا رہا ہے

کوئی منزل نہ کوئی سمت معین اپنی
ہم ہیں بے ربط کہانی کے ادھورے کردار

ذرے کا مدار جس نے توڑا
بیٹھا ہوا ہاتھ مل رہا ہے

ایک ہول سا سر زمینِ دل پر
آسیب کی طرح چل رہا ہے

جو دشمنی پہ تلے ہیں وہ جانتے ہی نہیں
کہ میرے ظاہر و باطن فقط محبت ہیں

ندیم کی غزل پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس میں خیال آفرینی اور جمال آرائی کے ساتھ ساتھ اظہار کی پاکیزگی، احساس کی شگفتگی اور جذبے کی طہارت کتنی شدت سے در آئی ہے۔ وہ لفظ و معنی کے تقدس میں اضافہ کرتا ہے اور قاری کو صداقت و محبت کے اٹوٹ رشتے میں منسلک کرتا جاتا ہے۔ ہر حال اور ہر رنگ میں اس کی انا قائم رہتی ہے۔ وہ حقیقت کے پراسرار بھیدوں کا ایک سچے تخلیق کار کی طرح انکشاف کرتا چلا جاتا ہے اور پڑھنے والا ایک نئی دنیا کی دریافت پر روحانی مسرت اور جمالیاتی کیف سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ندیم اس عہد کا وہ تنہا حساب دان جمال ہے جو اپنی زبردست فکری انفرادیت اور تخلیقی توانائی کی وجہ سے اس عہد اور آنے والے عہد کے درمیان رابطے کی ایک اہم علامت ہے۔ وہ اس صدی کی چوتھی دہائی سے لے کر اس آخری دم توڑتی دہائی تک اس ہراول دستے کا قافلہ سالار ہے جو اپنے تخلیقی سفر کے ساتھ ساتھ نئے قلم کاروں کو منظرِ عام پر لانے اور انہیں حرف کی حرمت سکھانے اور قلم کا اعتماد بخشنے کا فریضہ ادا کرتا رہا ہے۔ "فنون" کے صفحات اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔ ندیم کے دم سے ادیبوں اور شاعروں کی ایک کہکشاں آسمانِ ادب پر اپنی پوری تابندگی و درخشندگی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اسی لئے وہ پر اعتماد لہجے میں کہتا ہے کہ ۔

ندیم میرے جلو میں تھی نسلِ مستقبل
میں صرف ایک تھا اور بے شمار ہو کے چلا

احمد ندیم قاسمی ---- تیسری دنیا کا شاعر

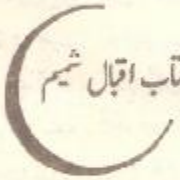

آفتاب اقبال شمیم

اگر ہم احمد ندیم قاسمی کی شاعری کو گذشتہ نصف صدی کی تاریخ کے مصدر سے نکلتا ہوا دریا تصور کریں اور اس میں رواں اور ٹھہرے ہوئے عکسوں کو تاریخی اور عصری حوالوں سے پہچاننے کی جستجو کریں تو ہمیں رجا سے اجلائے ہوئے آب شفاف میں آسمان کے بجائے زمین اور زمانے کا دور تک پھیلا ہوا منظر نظر آئے گا' جس سے بارشوں میں اڑتی ہوئی مٹی کی خوشبو اور آنکھوں میں تیر کر اترتی ہوئی حسین چہروں اور منظروں کی تمازت' ہم پر ہمارے حواس اور احساس کی رسائی کے کم یا زیادہ ہونے کا انکشاف کرے گی۔ اور اگر ہم اس دریا کی سبک رو اور متلاطم موجوں اور سر اٹھا کر بہنے والے دھارے کی زیریں لہر کو دیکھنے کی بصارت رکھتے ہوں تو ہمیں اس روشنی کا سراغ ملے گا جو انسان کے تاریخی شعور اور انسان کے قدیم اور اشرف ہونے کے باطنی ادراک سے نکلتی ہے' جو وجود' فطرت اور معاشرت میں تصادم سے رونما ہونے والے جدلیاتی تغیرات سے آگہی اور زمین کی تخلیقی قوت کے لا انتہا امکانات کے شعور سے پھوٹتی ہے۔

اس روشنی کی ترکیب میں سب سے نمایاں رنگ اس تاریخی شعور کا ہے جو انسان کو عدم تحفظ کے خطرے اور خواہش بقا کی خارجی اور داخلی صورت حال میں تجربے' جبلت اور دانش کے بنائے ہوئے خاکے پر اپنی پناہ گاہیں تعمیر کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ یہی انسان ندیم کی شاعری کا مرکزہ ہے۔ ندیم اسے عنصری انسان Elemental Man کی شکل میں دیکھتے ہیں جو اپنے امکانات کے باوصف مثالی انسان Idial Man بھی ہے۔ وہ ہجوم بھی ہے اور فرد بھی۔ وہ زمین کی مقصدی تخلیق ہے۔ اور زمین کا ایسا خواب یا زمین کی تمنا کا ایسا اظہار ہے جس کی وساطت سے وہ خود سے بلند تر ہونا چاہتی ہے' آسمانوں سے جا ملنا چاہتی ہے اور کائنات کا مرکز بن کر اسے اپنے محیط میں لینا چاہتی ہے۔ اس نے انسان کو بقا' آزادی' محبت اور ہار نہ ماننے کے جذبے جیسی بے بدل نعمتوں سے نوازا ہے۔ اس کی ذات میں جبلت کے عمیق اسرار اور شعور میں تمدن کی انتہائی بلندیوں پر چمکنے کی پر شکوہ خواہش پیدا کی ہے۔ اور زمین کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ انسان اس کے قدیم خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی سمت پر آگے بڑھتا جائے۔ ندیم عقلی اور وجدانی سطح پر زمین کے اس ازلی ارادے اور انسان کی اس سلسلے میں عظیم مہم جوئی کے نتیجہ خیز ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ مثلاً دوام' کی ایک نظم کا آغاز یوں کرتے ہیں ۔

کبھی جب میں زمیں کی رفعتوں سے
آسماں کی پستیوں میں جا اترتا ہوں

اور اس نظم کو ختم یوں کرتے ہیں ؎

اگر میں آسماں پر وہ نہیں ہوں' جو زمیں پر ہوں
تو میں جو کچھ بھی ہوں' اپنی زمیں سے ہوں
اگر انسان ہوں تو اپنی مٹی کے یقیں سے ہوں

اور یہی یقین انکی شاعری میں رجائیت کا ماخذ ہے۔ لیکن یہ نہیں کہ وہ انسان کی اس عظیم مہم جوئی کی راہ میں حائل رکاوٹوں' تضادوں اور حال

و مستقبل کی بدشگونیوں سے باخبر نہیں۔

ادھر پتوں پہ شبنم آئینے بن کر اترتی ہے
ادھر ٹوٹے ہوئے ذرے کا جوہر
اپنے دانتوں میں لئے شہ رگ زمیں کی
دندناتا پھر رہا ہے
جیسے اب جو کچھ بھی ہوگا' صرف اس کے حکم سے ہوگا

ہلاکتوں کے یہ سامان اور نفرتوں کے یہ تیور تاریخ کے جبر کی علامتیں ہیں اور انسانی رشتوں میں ایک غلط معاشرت کی پیدا کردہ ہوس کی کارفرمائیاں ہیں ندیم کے نزدیک انسان کی راہ میں حائل تضادات کا ماخذ نہ فطرت سے انسان کا ٹکراؤ ہے' نہ وقت سے تصادم' فطرت اگر کل ہے تو خود انسان اسی کل کا ایک جزو ہے اور وقت اگر قاہر ہے تو کریم بھی ہے۔ نسلوں کا تسلسل اور نمو کا عمل اسی کے دم قدم سے ہے۔ انسان میں وہ بے پناہیاں موجود ہیں کہ وہ فطرت اور وقت کے بیشتر علاقوں کو تسخیر کر سکے۔ لیکن اس کا حقیقی تصادم ایک ایسے نظام جبر سے ہے جو اس نے خود اپنے آپ پر مسلط کیا ہے۔ ہمارا تاریخی شعور اس نظام کے اصل چہرے سے واقف ہے۔ ہم شہروں اور دیہاتوں میں بسنے والے صدیوں سے اس جبر کو سہہ رہے ہیں' جس نے ہماری آزادیوں کو اپاہج اور ہماری محبتوں کو بے دست و پا بنا رکھا ہے۔ ہم سرپٹ دوڑنے والی رتھوں کے نیچے اور دندناتے ہوئے ٹینکوں کے تلے بار بار مسلے گئے ہیں۔ ہمیں گلیوں میں دبے پاؤں چلنے والی دباؤں اور ہڈیوں کو چڑ مڑ کرنے والے قحطوں نے کتنی بار فنا کیا ہے۔ ناداریوں کی سست رفتار موت سے کیسے بستیاں سسک سسک کر اجڑتی رہی ہیں۔ ان سب المیوں کا ذکر ندیم کی شعری دستاویز میں موجود ہے۔ ندیم اپنے گھر سے لے کر اس دنیا کے آخری گھر تک' جبر کی خفیہ یا اعلانیہ کارفرمائیوں کی نہ صرف خبر رکھتے ہیں بلکہ انکی نشاندہی کرتے ہیں' انکی تردید کرتے ہیں اور انکے خلاف آواز حق بلند کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اس دور میں صداقتوں کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے کتنے ہیں اور سمجھوتے کے اقرار نامے پر انگوٹھا ثبت کرنے والے کتنے سچ کو تسلیم کرکے اس پر قائم رہنے کے اس دور جہاد میں ندیم نصف صدی سے ایک تناور درخت کی طرح کھڑے ہیں' جس کی ہریالیوں کو کسی آندھی کا زور مدھم نہیں کر سکا۔ ہماری شاعری میں Sublimity کی ایسی مثالیں کچھ کم ہی ملتی ہیں۔

ندیم تیسری دنیا کے شاعر ہیں۔ اس بیان کی اصولی توجیہہ سے پہلے میں ایک مختصر سے واقعے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ بیجنگ میں چینی ادیبوں کی ایک ملک گیر کانفرنس میں ایک بار مجھے شامل ہونے کا موقع ملا۔ وہاں پر دور حاضر کے سب سے اہم اور سربرآوردہ ادیب ماؤ تن سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ماؤ تن نے یہ جان کر کہ میں پاکستانی ہوں' اپنے پہلے ہی جملے میں مجھ سے پوچھا کہ ندیم کا کیا حال ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ ندیم آپکا ہی نہیں' ہمارا بھی شاعر ہے ...... ظاہر ہے کہ عام انسان کے ساتھ ندیم نے ذہنی رفاقت اور جذباتی قرب کا جو رشتہ استوار کیا ہے اسکا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ اپنی شناخت ان خلقتوں کی صفوں میں کریں جو یہاں اور وہاں استحصال کا شکار ہیں۔ انہوں نے اپنے شعر و افسانہ میں اسی مسلک کو اپنایا ہے۔ ان کا یہ رویہ محض انسانی ہمدردی اور انسانیت نوازی تک محدود نہیں' نہ ہی یہ رویہ ان کی روشن خیالی کا ثمرہ ہے بلکہ انکا وجودی فیصلہ اور انکی Commitment ہے۔ اور یہ فیصلہ اس فکری نظام کی بنیاد پر قائم ہے جس کا ذکر میں ابتدا میں کر چکا ہوں۔ دراصل یہ ہمارے دور کے ہر دیانت دار اور ثابت قدم دانشور کا فیصلہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اس کرۂ ارض کو نئی کروٹ لیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اسی صدی کے پہلے اور دوسرے عشرے میں انسان نے ایک نئے سفر کا آغاز کیا تو آبادیاتی اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ایشیا اور افریقہ میں یک لخت آزادی کی تحریکوں کا لاوا ابل پڑا۔ سائنسی علم' جس کی بدولت نو آباد کاروں نے ابتدا میں بالادستی حاصل کی تھی' بعد میں خود ان کی پسپائی کا سبب بن گیا۔ اس علم نے شعور کو ایک نئی ضو بخشی۔ ماضی کے ہر تصور کو تلوار کی دھار پر سے گزارا گیا۔ یہ پل صراط پر سے گزرنے کا مرحلہ تھا' جس سے گزر کر بیسوی صدی کی پہلی نسل آزادی کی تحریکوں میں شامل ہوئی۔ تیسری دنیا کے ہر ملک میں ان تحریکوں کی ہراول میں ادیب اور شاعر پیش پیش رہے۔ ندیم نے اپنے شعری سفر کا آغاز اسی فضا میں کیا۔ لیکن یہ سفر محض آزادیوں کی قصیدہ خوانی کا سفر نہیں تھا۔ ہوا یہ کہ تیسری دنیا سے پسپا ہونے والی قوتیں نیا روپ دھار کر اور نئے پینترے بدل کر دوبارہ آ دھمکیں۔ نئی سازشوں اور نئی حکمت عملیوں کے جال پھینکے گئے۔ نئے راس رچائے گئے اور یوں لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا۔ ایسی صورت میں شاعر کا منصب کیا ہو سکتا ہے ___ یہی کہ وہ چوکس رہے' اسکے شعر میں سچ کی شہادت' خوشبو کی طرح مہکتی رہے۔ ندیم کے آخری دونوں مجموعے محیط اور دوام اسی گواہی کی دستاویزیں ہیں۔ اور مشرق کی مظلوم خلقتوں' زندگی کے حسن اور مستقبل کے انسان کے نام معنون کئے جانے والے عہد نامے ہیں۔

ندیم

(یہ مضمون 7 دسمبر 1991ء کو ندیم کی پچھترویں سالگرہ کی تقریب میں پڑھا گیا)

ایوب خاور

پہلی بار سوچ رہا ہوں کہ کسی بڑے انسان کے بارے میں قلم ہاتھ میں رکھ کر' اور نظریں کاغذ پر جما کر سوچتے ہوئے ذہن کیسے کیسے سنانوں کی گونج میں گھر جاتا ہے۔ خصوصاً ایسے انسان کے بارے میں کوئی مضمون سوچنا' جس کی جہتوں کا شمار کوئی نہ ہو' اور زیادہ مشکلیں پیدا کر دیتا ہے اور میرے جیسے کم علم لیکن خوش نصیب شخص کے لئے تو اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتی ہے جسے ایسی ہمہ جہت شخصیت کی محفلوں میں قدم دھرنے کی جگہ تو مل جائے مگر وہ اس منصب کا اہل نہ ہو۔

جب میں چھوٹا تھا تو ظاہر ہے شعر پڑھنے کا شوق تھا۔ کئی شعرا ایسے بھی نظر سے گزرے تھے جن میں ہدم' ناصح اور واعظ کے ساتھ ساتھ ندیم کا لفظ بھی پڑھنے میں آتا تھا۔ اس وقت یوں لگتا تھا کہ ندیم کوئی ایسے صاحب ہیں جن سے ہر شاعر اپنے دکھ درد بیان کرتا ہے اور ندیم کا کام یہ ہے کہ وہ ان شاعروں کی دکھ بھری کہانیاں سنے۔ اردو شاعری کے معاشرے میں پیدا ہونے والا یہ شعری کردار ناصح' واعظ' اور زاہد کے بیچ ظلموں کے روایتی ہیرو کے دوست جیسا لگتا تھا۔

1970ء میں جب پہلی بار کسی بین الکلیاتی مشاعرے میں "فنون" کے جدید غزل نمبر کی دونوں جلدیں انعام کے طور پر ملیں تو میری ملاقات ایک اور ندیم سے ہوئی جس نے اپنے "فنون" کے ہر صفحے کی ہر سطر میں نہ صرف اپنے اپنے وقت کے خوبصورت' اور صاحب طرز شعرا کے دکھوں کو ان کے پورے احساس جمال کے ساتھ سمیٹا ہوا تھا بلکہ پوری ایک نسل کی نسل اپنے پر شکوہ آغاز کے ساتھ ایستادہ نظر آئی۔ تب مجھے لگا کہ وہ ندیم جسے اپنے شعری مضامین میں سارے شاعر اپنا محب' ہمراز' ہمدرد' دل کی بات سننے والا' اپنے سائے میں جگہ دینے والا ندیم کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں وہ شاید یہی ندیم ہے کیوں کہ "نقوش" سے لے کر "فنون" تک کے درمیانی عرصے میں پاکستان بھر کے جتنے ادیبوں اور شاعروں نے اپنے قدموں پر کھڑا ہونا سیکھا وہ سارے کے سارے ندیم صاحب کی انگلی پکڑ کر چلے ہیں۔

ناصحوں اور واعظوں کا ہم عصر ندیم تو صرف دکھ سننے والی مٹی سے' بنایا گیا تھا مگر اس ندیم کو تو میں نے دکھ درد سننے والی مٹی سے بنا ہوا پایا۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ندیم صاحب نے اپنے خطہ فنون میں جو خواب بھی کاشت کیا اسے اپنی تعبیر ملی' جو بیج بویا وہ ثمر بنا بلکہ اس ندیم کے خطہ فنون میں تو لوگوں نے اپنی کھوئی ہوئی شناخت پائی ہے۔ ایسا ندیم ہماری اردو شاعری کی روایت میں پہلے کہاں اور کسے نصیب ہوا ہوگا!

اس ندیم کے جدید غزل نمبر کو کالج میں اپنے اساتذہ کی مدد سے ابھی سمجھ ہی رہے تھے کہ "افکار" کا ندیم نمبر آگیا۔ اس نمبر کو دیکھا تو پتہ چلا کہ ندیم صاحب 20 نومبر 1916ء کو ضلع سرگودھا کی تحصیل خوشاب کے ایک گاؤں انگہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پہلا شعر 27 ۔ 1926ء کے دوران کہا' پہلی نظم 1931ء میں مولانا محمد علی جوہر کے سانحہ ارتحال پر

کی جو روزنامہ "سیاست" کے صفحہ اول پر "مولانا محمد علی جوہر" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ پہلا شعری مجموعہ قطعات کا تھا جو "دھڑکنیں" کے نام سے شائع ہوا۔ جب "افکار" کے ندیم نمبر کے صفحات پر پھیلی تصویروں اور اپنے وقت کے اہم ترین ادیبوں اور شاعروں کے مضامین جو ندیم صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے تھے، پڑھنے شروع کیئے تو پتہ چلا کہ اس ندیم کی تو بے شمار جہتیں ہیں۔ انسان دوست ندیم، محب وطن ندیم، ہر عہد کی نئی پود کے باصلاحیت ادیبوں اور شاعروں کا کولمبس۔ ندیم، ترقی پسند ندیم، عاشق رسولؐ ندیم، عجز و انکسار کی تجسیم۔ ندیم، حسن پرست ندیم، حقیقت پسند ندیم، شگفتہ مزاج ندیم احمد شاہ ندیم احمد ندیم۔ ندیم، افسانہ نگار ندیم، شاعر ندیم، نقاد ندیم، کالم نگار ندیم، صحافی ندیم، ہفت روزہ "پھول"، "تہذیب نسواں" ماہنامہ "ادب لطیف"، "سویرا"، "نقوش"، "سحر"، "امروز" اور "فنون" کا مدیر ندیم -------- نیک شریف اور دھیما ندیم، جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق بلند کرنے والا تیکھا، تیز اور منظم ندیم -------- اب آپ ہی بتایئے کہ اتنے بڑے انسان کے بارے میں کوئی مضمون سوچنا، جس کی جہتوں کا شمار کوئی نہ ہو، کتنا مشکل کام ہے۔

"افکار" کے ندیم نمبر کو دیکھا تو عبدالرحمٰن چغتائی رقم طراز تھے:

"احمد ندیم قاسمی اصلاح اور تنقید کے سلسلے میں ایک ایسے شدید جذبے کے مالک ہیں کہ ان کے قلم کے سامنے آیا ہوا سانس بھی نہیں لے سکتا۔"

ڈاکٹر تاثیر ان کے قطعات کے مجموعے "رم جھم" کے بارے میں کہتے ہیں (اور یہ غالباً قیام پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔)

"یہ قطعات حضرت ندیم کی شاعرانہ شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں پنجاب اور اس کے بھی ایک خاص علاقے کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے اور اس طرح کہ باہر کا کوئی شخص اس کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔"

"شعلہ گل" 1950ء کے لگ بھگ شائع ہوئی تو سالک صاحب نے کہا:

"میں نے "جلال و جمال" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایشیا کے افق پر ایک عظیم شاعر نمودار ہو رہا ہے، "شعلہ گل" نے میرے اس فقرے کی صداقت واضح کر دی ہے"

"دشت وفا" پر تبصرہ کرتے ہوئے فراق گور کھپوری صاحب نے کہا:

"پنجاب کی سرزمین سے ہی ایسا شاعر اٹھ سکتا تھا جس کی شخصیت میں نرمی اور کس بل کا حسین ترین سنگم نظر آئے اور توانائی اور نزاکت جس کی شاعری کی جان ہو"

اور صفحات الٹے تو مجتبیٰ صاحب کہتے نظر آئے:

"ندیم صاحب کی تخلیقات اور ان کی شخصیت نے ایک پوری نسل کی ادبی تربیت کی ہے"

آگے دیکھا تو سید ضمیر جعفری صاحب رقم طراز تھے:

"ندیم اردو ادب کا سب سے بڑا قوسیایا ہوا بک ہے"

جوش صاحب نے لکھا:

"ندیم صاحب اچھے شاعر ہی نہیں اچھے انسان بھی ہیں اور چونکہ اچھا انسان ہر دور میں نایاب رہا ہے اس لئے میں ندیم کی قدر کرتا ہوں"

مزید دیکھا تو حفیظ جالندھری صاحب مدیر "افکار" صہبا لکھنوی سے مخاطب تھے کہ:

"آپ کا صحیفہ "افکار" چار پانچ سو صفحے ندیم کے بارے میں میری رائے کے لئے وقف کر ہی نہیں سکتا"

اب اتنی بڑی بڑی شخصیتیں ندیم صاحب کے بارے میں یوں رقم طراز ہوں تو میری مشکل کا اندازہ لگایئے۔ میں کس ندیم کے دروازے پر دستک دوں؟ کیا اس ندیم کے دروازے پر جو اب تک تقریباً بارہ تیرہ ہزار سیاسی، طنزیہ، اور مزاحیہ کالم لکھ چکا ہے؟ یا "کفن دفن"، "گھر سے گھر تک"، "سلطان"، "پرمیشر سنگھ"، واضح ندیم صاحب کو ڈھونڈوں یا اس ماہر نفسیات کا ہاتھ پکڑوں جس نے "رئیس خانہ"، "آکیلی"، "وحشی"، "کنجری" اور "جن و انس" جیسی بھرپور نفسیاتی کہانیاں دیں، یا اس شاعر ندیم پر مضمون لکھوں جس کی غزل نے جدید غزل کو ایک ایسا چہرہ عطا کیا کہ جس پر کسی نقش کے اضافے کی کوشش میں نقش گر کا قلم ٹوٹ جائے، یا پھر اس نظم گر ندیم کے بارے میں کچھ کہوں جس نے "ایک تالاب کی کہانی"، "پتھر" اور "انسان عظیم ہے خدایا" جیسی عظیم نظمیں تخلیق کیں یا اس نقاد کے بارے میں سوچوں جس نے "تہذیب و فن" جیسی کتاب لکھی یا اس مدیر کو احاطہ تحریر میں لاؤں جس نے "نقوش" جیسے ادبی رسالے کی نہ صرف ابتداء کی بلکہ ادبی رسالوں میں نمبر نکالنے کی رسم کو قبول عام کے درجے پر فائز کیا۔

کون ہے اتنا تہہ دار اور پہلو دار 75 سالہ کھلنڈرا نوجوان خطہ پاک پر اس ندیم جیسا جس نے اتنا ڈھیروں کام کیا ہو، اور اپنے معیار سے رتی برابر نیچے نہ سرکا ہو، اور پھر ویسے کا ویسا تازہ دم۔ یار لوگ اپنی ایک آدھ غزل یا نظم پر ہی اپنے مقبرے تعمیر کر لیتے ہیں اور وہ بھی پکے -------- سنگ مرمر کے -------- تاکہ باہر کے موسم اندر کی لاش کو نہ تو نم دے

سکیں نہ اس کی بدبو باہر کے موسم کو بوجھل کرے۔

وہ جو کسی نے کہا ہے ناکہ:

بات یہ ہے کہ آدمی' شاعر
یا تو ہوتا ہے یا نہیں ہوتا

تو اس طرح کی دو ٹوک بات کرنا پڑتی ہے۔ ندیم صاحب کے بارے میں بھی صاحبو ------ زندگی کو خدا نے لوگوں کے درمیان نیکی کی طرح نازل کیا ہے۔ جن لوگوں نے زندگی کو نیکی کے لباس میں نہ صرف قبول کیا بلکہ دوسروں میں بھی تقسیم کیا وہ سارے کے سارے احمد ندیم قاسمی ہیں۔ یہ سب اس لئے کہہ رہا ہوں کہ نیکی ہی انسان کو انسانیت کے درجے پر فائز کرتی ہے اور ندیم صاحب نے آدھی صدی تک جو کچھ لکھا' جتنا کچھ لکھا اس میں ان کا بنیادی موضوع انسان' انسان کی تکریم کی خواہش اور انسانیت کا پرچار ہے۔

وہ خود کہتے ہیں:

"آپ کو میرے نظریہ فن کی ایک ہی بنیاد نظر آئے گی اور وہ ہے انسان دوستی' انسان کا احترام اور انسان کا وقار اور اس کی عظمت۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس بنیاد سے منحرف نہیں کر سکتی"

یہ بات صرف ندیم صاحب جیسا شخص ہی کہہ سکتا ہے جس نے انسان سے محبت کو اپنی روز مرہ زندگی کا حصہ بنا لیا ہو۔ ندیم صاحب ایک ایسے برگد کی طرح ہیں جس کی چھاؤں میں ایک ماورائی ٹھنڈک ہے۔ ان کی چھاؤں میں بیٹھ کر سو جانے کو جی نہیں چاہتا بلکہ اگلی منزلوں کو فتح کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ وہ ایک ایسے سنگ میل کی طرح ہیں جو اگلے کوسوں کی نشانیاں مسافر کے ہاتھ میں تھما کر عازم سفر کرتے ہیں۔ پاکستان کے ادبی منظر نامے کے سارے راستے ادھر ادھر سے گھومتے گھماتے آخر کار ندیم صاحب کی ذات پر آکر ختم ہوتے ہیں اس لئے مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ اس وقت ہم سب پاکستان کی سب سے بڑی' سب سے طاقتور اور معتبر ترین ادبی شخصیت احمد ندیم قاسمی کی 75 سالہ سالگرہ کا جشن منا رہے ہیں۔ میں اتنی دیر سے انہیں کسی نہ کسی پہلو سے اپنے قلم کی زد میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن لگتا ہے کہ میں اس بچے کی طرح ہوں جسے درخت پر چڑھنا نہیں آتا اور درخت پر چڑھنے کی کوشش میں پھسلا جا رہا ہے جبکہ درخت نہ صرف بہت اونچا اور بہت گھنا ہے بلکہ اس کے تنے' اس کی شاخوں اور ٹہنیوں پر کوئی گھنڈ' کوئی کانٹا' کسی طرح کے نشیب و فراز نہیں جہاں کوئی اپنے پاؤں جما سکے۔ اس شجر کا تنا' شاخیں اور ٹہنیاں تو انتہائی صاف اور شفاف ہیں' بالکل آئینے کی طرح۔ کوئی اس پر اپنے قدم کیسے جما سکتا ہے۔ خدا سلامت رکھے اس شجر کو۔ ابھی تو صرف 75 بہاریں دیکھیں اس نوجوان نے۔ ابھی تو زندگی پڑی ہے ------ خوبصورت اور خوشگوار زندگی ------ برتنے کے لئے اور دوسروں میں بانٹنے کے لئے۔

23 اکتوبر 1976ء کو عصمت چغتائی صاحبہ کے اعزاز میں فلم ساز شباب کیرانوی کی دعوت میں چند مہمان
دائیں سے بائیں شباب کیرانوی۔ قتیل شفائی۔ احمد ندیم قاسمی عصمت چغتائی محمد طفیل اقبال زبیری اور ریاض الرح

۔ار تحال پر

احمد ندیم قاسمی

ادب کے منگلا ڈیم سے مینارِ پاکستان تک

سید ضمیر جعفری

منگلا ڈیم

احمد ندیم قاسمی اس دور کی ایک اہم ادبی شخصیت ہیں۔ فردا ------ حال سے کٹا ہوا نہیں' بندھا ہوا ہوتا ہے۔ ہر دور میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ تاریخ ان کی زندگی ہی میں' ان کی پائیدار عظمت کی نشاندہی کر دیتی ہے۔ ندیم انہی اہل قلم میں سے ہیں' جن کی روشنی حال سے نکل کر فردا میں جھلملا رہی ہے۔ ان کی آواز ہمارے دور کی نمائندہ آواز ہے جو دھڑکن اور روشنی بن کر زندگی کے دل میں اتر گئی ہے۔ ندیم کے بارے میں کچھ لکھنے کی نیت سے جب تک قلم اٹھایا نہ تھا' ان کے متعلق کچھ لکھنا سہل معلوم ہوا۔ مگر جب لکھنے بیٹھا تو یہ مرحلہ انتہائی دشوار نظر آیا۔ ذہن میں جھانکتا ہوں تو دور' دور تک' پھولوں اور ستاروں اور نغموں کا "میلہ چراغاں" بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے ندیم کی شخصیت پر جتنا غور کرتا ہوں اتنا ہی اس کا پیکر رنگوں اور خوشبوؤں میں تحلیل ہو کر فضا میں پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اے کاش۔ اس لطافت اور شیرینی کو کماحقہ بیان کرنے کے لئے موزوں الفاظ موجود ہوتے اور اگر موجود ہیں تو میری دسترس میں بھی ہوتے۔

زندگی میں مختلف اور معروف راستوں پر چلنے کے سبب سے آرزو کے باوجود مجھے ندیم سے دوستی کی پینگیں بڑھانے کا موقع تو نہ مل سکا۔ لیکن میں ان سے محبت ضرور رکھتا ہوں یہ محبت چونکہ وصال سے زیادہ فراق کی راہوں سے گزرتی رہی ہے' لہٰذا اس کی شدت کا اندازہ میں ہی کر سکتا ہوں۔ جب میں پہلی مرتبہ ان سے بغلگیر ہوا تھا تو طبیعتیں پہلے ہی ایک دوسرے سے بغلگیر ہو چکیں تھیں' یہ ذات سے ذات محسوسات سے محسوسات کی ملاقات تھی توقع یہی تھی کہ اس پس منظر سے' ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر برآمد ہوں گے' اور زندگی کے راستے پر قدم سے قدم ملا کر چلیں گے لیکن دو قدم ہی چلے ہوں گے کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ ان کے قدم جیل خانے کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ قصہ کوتاہ یہ کہ میں اپنی روٹی کے انتظام میں اور وہ دوسروں کی روٹی کے بندوبست میں اپنے اپنے راستوں پر مصروف ہو گئے۔

دہلی لکھنؤ' حیدر آباد (دکن) کی وہ جانیں' لیکن پنجاب کے جتنے ادیب آج عمر کے لحاظ سے پچاس برس کے پیٹے میں ہیں' ان میں سے بیشتر آج سے کوئی تیس برس پیشتر پنجاب کے مختلف کالجوں میں تحصیل علم کے مختلف مرحلوں سے گزر رہے تھے اور ایک بات ان سب میں مشترک تھی کہ

ہو ذرہ جس جگہ تھا وہاں آفتاب تھا

یعنی کالج کے ادبی حلقوں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔

ان میں سے بیشتر شعراء نے آگے چل کر زندگی کے سامنے قلم رکھ دیا جیسے کوئی سپاہی دشمن کے سامنے ہتھیار رکھ دے۔ ہمارے کالج (گورنمنٹ کالج کیمبل پور) میں ملک اختر حسین (بعد میں لیفٹیننٹ جنرل) شیر محمد شاد (بعد میں کرنل) اور بخشی انور علی انور (آج کل پرنسپل گورنمنٹ کالج مری) کا طوطی برابر برابر بول رہا تھا۔ ان میں سے اختر اور شاد ادب کا میدان چھوڑ کر جنگ کے میدان میں چلے گئے۔ سبز طوطی کی آواز سے کان موڑ کر انہوں نے دوسری جنگ عظیم میں جنگل گرین وردی (JUNGLE GREEN) پہن لی۔ البتہ بخشی انور علی انور کی بیش قدر بفضل تعالیٰ اب تک محاذ ادب پر جاری ہے۔ ہم لوگوں کی ادب سبھا کالج کی "ٹک شاپ" میں جما کرتی

جہاں کبھی گرم کرارے سموسوں اور کبھی نرم ٹھنڈے شربتوں کے ساتھ ساتھ ادبی مسائل زیر بحث رہتے۔ ادبی مسائل میں عموماً مختلف کالجوں کے درس گاہی جریدوں کو جو ہماری لائبریری میں بہت کم آتے اور التزام سے بھی آتے۔ بطور خاص خوردبین لگا کر دیکھا جاتا' ایک مرتبہ' سری پرتاپ سنگھ کالج سرینگر کے ایک شاعر بلبل کے اس شعر کا کئی روز تک تذکرہ ہوتا رہا۔

میرا نام گل ہے تخلص ہے بلبل
سلام علیکم اڑا چاہتا ہوں

احمد ندیم قاسمی کا غلغلہ پہلے پہل ہمارے ہاں ہماری اس ادب سبھا میں اٹھا (یہ بعد میں پتہ چلا کہ وہ کیمبل پور میں زیر تعلیم بھی رہے)۔ ہوا یہ کہ ایک دن نثار صاحب ایک رسالہ اٹھا لائے (غالباً صادق ایجرٹن کالج' بہاول پور کا میگزین تھا) جس میں سے انہوں نے ایک نظم اپنے ایک مخصوص جارحانہ ترنم میں پڑھ کر سنائی اور پھر دو ٹوک لہجہ میں فیصلہ صادر کرتے ہوئے بولے ——— اس کو کہتے ہیں عالم آرائی۔

یہ کسی پیر زادہ احمد ندیم قاسمی کی نظم تھی۔ نظم میں دیہاتی زندگی کی اتنی خوبصورت اور سچی عکاسی کی گئی تھی کہ جیسے ایک ایک شعر کے چہرے پر خود میرے اپنے گاؤں کی سنہری دھوپ چمک رہی ہو پھر یہ نہیں کہ شاعر محض کیکر' پھلاہی' شہتوت کے درخت گنواتا چلا گیا ہو۔ یا کسی کسان کے ہاتھ میں حقہ تھما کر خود کسی نہر میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا ہو۔ ایسا نہ تھا' نظم میں الھڑ پنے کی معصومیت بھی تھی اور نوجوانی کی امنڈتی ہوئی رومانیت بھی۔ مگر اس کا ریشہ ریشہ زندگی کی دھڑکنوں سے بنا ہوا تھا' منظر کا جسم' جسقدر خوبصورت تھا۔ اس کی روح اتنی ہی دردمند تھی مجھے یاد ہے "ادب سبھا" میں کالج کے دانشوروں کی "ہندو لابی" کے گورکھ منوہر لال دھوپر نے کہا تھا ———

"اس لوک کے شبد بشری بجاتے ہوئے آتے ہیں۔" ہمیں جب بھی کوئی غیر معمولی ادبی نعمت دستیاب ہوتی تو ہم لوگ اس کی قدر و قیمت پر مذاکرے کی نیت سے ایک باقاعدہ وفد کی صورت میں پروفیسر مولوی انعام علی بیگ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے کہ کیمبل پور میں مذاق شعر و ادب کی آخری مرانہیں کے پاس سمجھی جاتی تھی۔ آج بھی ہم اس نظم کا جلوس باندھ کر ان کے پاس پہنچے۔ مولوی انعام علی بیگ عربی کے استاد اور فارسی کے شاعر تھے۔ ایک دو غزلیں اردو میں بھی کہہ رکھی تھیں ادبیات پر ان کے نقد و نظر کا انداز کچھ ایسا ہوتا کہ نظم یا غزل سن کر کوئی لمبی چوڑی بحث اٹھانے کی بجائے کوئی ایک عارفانہ سا جملہ کہہ دیتے جس کی تعبیر و تفسیر آپ اپنی توفیق کے مطابق خود کرتے رہیے۔ مولوی صاحب کے سامنے نظم کی خواندگی کا فریضہ نثار صاحب نے اپنے مخصوص ترنم میں ادا کیا۔ ترنم کے بعد مولوی صاحب نے وہ نظم دوسری مرتبہ تحت اللفظ میں سماعت فرمائی۔ کیونکہ ان کے بقول شعر کی قدر و قیمت کا اندازہ ترنم سے نہیں' تحمل' سمجھ' تفکر وغیرہ سے ہوتا تھا۔ نثار پڑھ چکے' تو مولوی صاحب نے رسالہ اپنے ہاتھ میں لے کر ایک مرتبہ پوری نظم کو' دل ہی دل میں' چبا چبا کر خود پڑھا پھر کچھ دیر آنکھیں بند کر کے اپنے اندر دیکھتے رہے' پھر دائیں بائیں سر ہلانے کے بعد ارشاد فرمایا:

"یہ گھوڑا اگر دوڑتا رہا تو ریس (RACE) جیت جائے گا۔"

اس کے بعد پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کی جو چیز جہاں بھی نظر آتی ہم لوگ اس کو "ٹک شاپ" میں باجماعت پڑھتے خوبیوں کے علاوہ ان کے شعروں میں سے "کیڑے" پکڑنے کی بھی بہت کوشش کرتے مگر عموماً ہر نظم کے بعد مولوی انعام علی بیگ صاحب کو جا کر یہ اطلاع دینا پڑتی۔

"جناب آپ کا گھوڑا بڑی تیزی سے دوڑ رہا ہے۔"

اور مولوی صاحب یہ سن کر ایسی مسکراتی ہوئی نگاہوں سے ہمیں دیکھتے جیسے فی الواقع انہیں کا گھوڑا دوڑ رہا ہو ——— قاسمی صاحب کی چیزیں زیادہ تر دور افتادہ ضلعی پرچوں میں نظر آتیں ——— دھوپر اگرچہ ہندو تھا۔ مگر چونکہ میانوالی میں پلا بڑھا تھا' اس لئے پنڈت ٹوک چند محروم کی معنوی اولاد معلوم ہوتا تھا۔ یعنی فارسی اردو میں ڈھلا ہوا ہندو ایک روز دھوپر ایک نیا رسالہ اٹھا لایا' اور رسالے کو ہلاتے ہوئے بولا۔

"ایں گل دیگر شگفت! ——— ذرا یہ کہانی دیکھو"

——— یہ پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ تھا۔ بصیرت کی اس وقت نہ ہمیں خبر تھی نہ ضرورت۔ ہم تو لذت' کشش اور تاثر کے گاہک تھے' سو یہ سب نعمتیں ان کے افسانے میں بڑے ہی پیارے توازن اور بانکپن کے ساتھ موجود تھیں۔ بصیرت پیچھے پیچھے خود بخود چلی آئی تھی۔ شعر کی طرح ان کی نثر بھی سیدھی دل میں جا کر ترازو ہوتی۔ کہانی میں کپاس کے چنتے ہوئے پھولوں کے درمیان روتی ہوئی زندگی کا کوئی مرقع پیش کیا گیا تھا۔ افسانے کے اکثر کردار ہمیں اپنے ہی رشتہ دار معلوم ہوئے یہ 1935-36ء کی بات ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ دو ایک برس بعد میں ندیم کو چھو کر بھی دیکھ لوں گا یہ 37ء یا 38ء کا واقعہ ہے' ندیم شہرت کے زینے تیزی سے طے کر رہے تھے' میں اسلامیہ کالج لاہور کے رواز ہوسٹل میں رہتا تھا۔ جہاں ایک طرف نثار صدیقی' اختر ہوشیارپوری' اور تابش صدیقی

ایسے طلباء شاعر متیم تھے جو آگے جا کر مشاہیر ادب میں شمار ہوئے وہاں دوسری طرف جہلم، سرگودھا اور میانوالی کی طرف کے خالص توانا تندرست، نٹ بال اور کبڈی کے کھلاڑی طلباء کا بڑا "ڈپو" (DEPOT) قائم تھا۔ شاعر طبع ہونے کے باوجود چونکہ میں تن و توش اور لباس کی وضع و تراش نیز عام نشست و برخواست میں انہی طلبہ کا ہم سخن و ہم قدم تھا' لہٰذا ادب و شعر کے معروف حلقوں کی طرف ہمارا گزر کم ہوتا طلبہ کا یہ گروہ طرے دار پگڑیاں باندھتا' اور لمبی لمبی اچکنوں کے ساتھ تنگ موہری کی بھاری' تہہ دار چنی ہوئی شلواریں پہنا کرتا' مونچھیں اگر نکل آئی تھیں تو ہم لوگ ان کو واپس نہیں جانے دیتے تھے۔ ہمارا زیادہ وقت گھی پی کر ورزش کرنے۔ انار کلی میں گھومنے گھامنے یا کسی نہ کسی شناسا نے میں الجھ کر ہاتھا پائی' مار کٹائی وغیرہ کے مشغلوں میں گزرتا۔ عجیب بات ہے کہ ندیم سے میری پہلی ملاقات کسی "حلقہ سخنوراں" میں نہیں ہوئی۔ بلکہ اس "حلقہ پیل تناں" میں ہوئی۔ وہ ایک روز ریواز ہوسٹل میں متیم پانچ چھ نیازیوں سے ملنے آئے تو اس نرغے میں مجھ سے بھی ملاقات ہو گئی' سہ پہر ڈھلنے پر جب انار کلی میں ستاروں کے اترنے کا وقت ہوا' تو نیازیوں کا جتھا' طرے لہراتا شلواریں کھڑکھڑاتا انار کلی کی یلغار پر نکل گیا۔ مگر میں اور ندیم دیر تک بیٹھے ادب و نثر کی باتیں کرتے رہے۔ ندیم ابھی تک پیرزادہ احمد ندیم قاسمی تھے شاعر کا نام اس وقت سکڑتا ہے جب اس کی شہرت پھیلنے لگتی ہے۔ وضع قطع وہی تھی جو ہونی چاہئے تھی۔ گاؤں کا ٹھیٹھ نوجوان جیسے اپنی کسی نظم یا افسانے میں سے ابھی ابھی نکلا ہو۔ لباس سادہ مگر ستھرا۔ خلوص۔ سچائی اور انکسار کا پیکر۔ میٹھا میٹھا دھیما سا لہجہ' بات ٹھہر ٹھہر کر سوچ سوچ کر گویا کوئی لفظ ادا کرنے سے قبل اس کی ذمہ داری بھی قبول کر رہے ہوں۔ چہرے پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ۔ آنکھوں میں وہ غیر معمولی چمک جو مروت' ہمدردی اور خوش خیالی کے جذبے اور افق پار کسی چیز کی مسلسل تلاش کی کاوش سے پیدا ہوتی ہے اور ہاں رخسار پر زخم کا وہ نشان بھی' جو ندیم کی شخصیت کا "قومی نشان" ہے' ان کے خدوخال کی کشش کو تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ بیان کرنا مشکل ہے۔ ہاں مجموعی طور پر ان کو دیکھ کر ایک مردانہ جاذبیت اور شریفانہ وقار کا احساس ہوتا تھا۔ بعد میں جیسے جیسے ان کا فن نکھرتا گیا' ان کے لباس میں بھی نفاست اور سلیقے کا رکھ رکھاؤ سنورتا چلا گیا۔ ندیم شاعری کے علاوہ زندگی میں بھی کام آنے والے ایک صحت مند' خوش ذوق' صاف ستھرے انسان ہیں۔

ندیم ان دنوں کالج سے تازہ تازہ نکلے تھے۔ اور دو ایک سرکاری ملازمتوں کو سونگھ سانگھ کر' اب لاہور میں اپنی پسند و مذاق کا کوئی کام تلاش کر رہے تھے ادبی حلقوں میں اگرچہ ان کی شہرت تیزی سے پھیل رہی تھی۔ تاہم لاہور میں وہ ابھی نووارد تھے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ اس عظیم شہر میں جناب مولانا غلام مرشد یا ریواز ہوسٹل کے "چند نیازیوں" کے سوا وہ کسی شخص سے متعارف نہیں ہیں۔ گویا جہاں تک لاہور کی زندگی کا تعلق تھا۔ میں ندیم سے سینئر تھا۔ چنانچہ میں نے پہلے تو اپنی پرواز خیال کے مطابق' ان کو سرکاری ملازمت ترک کرنے پر ایک طرح کی سرزنش کی کہ پیارے یہ تو نے برا کیا کیونکہ ادب میں روٹی نہیں ملتی۔ پھر ادب کے میدان میں ان کو مشورہ دیا کہ بھائی صاحب یہاں کے ایڈیٹروں سے بھی کچھ راہ و رسم نکالو۔ یہ لوگ شعر نہیں واقفیت چھاپتے ہیں۔ مجھے یاد ہے' ندیم نے مسکرا کر جواب دیا تھا ------ "میرے شعر میں جان ہوگی تو چھپ جائے گا' ورنہ اس کا نہ چھپنا ہی بہتر ہے" یہ جواب سن کر مجھے شاید ایک جھرجھری سی بھی آئی اور دل میں شاید کچھ کچھ ہنسی بھی۔ مجھے اس وقت اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ دور افتادہ جگہ میں اگا ہوا یہ سادہ سا نوجوان ایک روز لاہور شہر کے دل پر حکومت کرے گا اور اردو ادب کا ایک پورا دور اس کے نام اور کام سے روشنی پائے گا۔

لاہور کی ادبی زندگی میں ان دنوں ابوالاثر حفیظ جالندھری اور شاعر رومان حضرت اختر شیرانی کا طوطی بول رہا تھا۔ حفیظ صاحب کوٹھیوں میں رہتے اور موٹروں میں گھومتے یوں بھی کچھ باقاعدہ سے' کچھ لئے دیئے سے' دور کے ڈھول بعض اوقات غلط بھی سنائی دیتے ہیں۔ ہم نے از خود یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم حفیظ کے آدمی نہیں اختر کے آدمی ہیں۔ شاعر رومان ایک تو ویسے ہی نوجوان نسل کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ پھر کالج کے آس پاس کے گلی کوچوں میں جھومتے جھامتے مل جاتے اور اللہ بخشے پہلی ملاقات ہی میں غیریت کا پردہ چاک کر کے الگ پھینک دیتے۔ ان سے ملاقات سہل بھی تھی اور خوشگوار بھی مجھ سے پہلے تابش صدیقی ان کے راسخ مریدوں میں شامل ہو چکا تھا۔ میں بھی تابش کے وسیلے سے ان کے حلقے میں پہنچا۔ وہ اپنے نامور والد علامہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی کے ساتھ فلیمنگ روڈ کی ایک دو تین منزلہ حویلی میں رہتے تھے جو ایک احاطے کے اندر واقع تھی۔ پہلی منزل سے بھی پہلے' ایک تنگ نیم تاریک سی بغلی کوٹھڑی میں ان کی نشست رہتی۔ خواب گاہ بھی یہی تھی۔ ایک چارپائی پر بستر' سامنے میز پر رسالہ رومان کا دفتر اور حجامت کا سامان ملاقاتی بھی یہیں آکر ان سے اپنے اپنے حسن یار کی باتیں کرتے۔ ندیم سے ان کے ہاں کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی۔

اختر کی محفل میں چونکہ بندہ و صاحب و محتاج و غنی۔ بالکل ایک ہو جاتے تھے۔ اس لئے ان کے بعض چھوٹے چھوٹے نیاز مند بھی ان کے سامنے گفتگو میں خاصی بے تکلفی کا انداز اختیار کر لیتے۔ ندیم غالباً واحد نوجوان تھے جو اختر کے حضور میں سر تا پا ادب کا مرقع بنے' خاموش بیٹھے رہتے۔ اختر اگر خاص طور پر ان سے کوئی بات پوچھتے تو جواب میں کوئی نپی تلی بات کہہ دیتے۔ ہو چکیلی بھی ہوتی اور اطلس' کمخواب میں لپٹی ہوئی بھی' ورنہ گھنٹوں بیٹھے رہتے اور وہی ---- جی جناب ..... بہت اچھا ..... بجا ارشاد فرمایا ------ کی سرحد سے آگے تجاوز نہ کرتے۔ اختر کے نیاز مندوں میں سب سے زیادہ سنجیدہ سب سے زیادہ مودب اور پارسا ندیم ہی تھا۔ یوں لگتا جیسے وہ اختر شیرانی کو دیکھنے' ان کی باتیں سننے' ان کی دیکھ بھال کرنے کی غرض سے وہاں کسی "ادبی یاترا" پر آئے بیٹھے ہیں۔ ندیم کی اس ادا میں عبادت کی سی پاکیزگی' خلوص اور لگن کا انداز ملتا۔

اختر شیرانی بھی ان کو بہت عزیز رکھتے۔ محبت تو وہ سبھی سے کرتے' لیکن ندیم کی عزت بھی کیا کرتے۔ ندیم کبھی لاہور سے باہر ہوئے اور ان کا خط آگیا تو اختر ان کے خط کو' ایک قلبی لطف کے لگاؤ کے ساتھ' اپنے احباب اور نیاز مندوں کو سنایا کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ نوجوان پیرزادہ احمد ندیم قاسمی کے اخلاص و اخلاق کا یہ پرتو اس کی شخصیت کے ایک بہت ہی اہم رخ کی ترجمانی کرتا ہے۔ میری رائے میں ندیم کی وسیع انسانی ہمدردی اس کے دل و نگاہ کی روشنی اور بصیرت' اس کی دردمندی اور دل نوازی نے جو اس کے عظیم فن کا امتیاز خاص ہیں' ندیم کی اعلیٰ سیرت ہی سے جنم لیا ہے یہ روشنی اس کی خود کشید ہے!

اس اثناء میں' لاہور سے جب میرا آب و دانہ اٹھا تو کوئی دس بارہ برس کی مدت کے بعد دوسری جنگ عظیم میں سے گزرتا ہوا راولپنڈی میں آکر بیٹھا۔ اب کبھی کبھار ندیم سے "روزنامہ امروز" کے دفتر میں "پیر و مرشد" مولانا چراغ حسن حسرت کی بارگاہ میں ملاقات ہو جاتی۔ مولانا حسرت "امروز" سے رخصت ہوئے تو اخبار کی کرسی ادارت ندیم کو تفویض ہوئی اس عرصے میں ندیم کی شہرت و عظمت کا آفتاب افق پر کئی نیزے بلند ہو چکا تھا۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر' منفرد افسانہ نگار' بالغ نظر نقاد' اور ایک باکمال صحافی اور انشاء پرداز کی حیثیت سے مانے جا چکے تھے ان کی ریڈیائی نگارشات کی دھوم تھی۔ ان کے فکاہی کالم کی خوشبو دور دور تک پھیل رہی تھی۔ کامیابی کے ساتھ دو ایک ظموں کے مکالمے لکھنے کا سہرا بھی ان کے سر بندھ چکا تھا۔ گویا عسکری زبان میں وہ بیک وقت چھ سات مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے مورچہ کھود کر بیٹھے ہوئے نہ تھے' آگے بڑھ کر لڑ رہے تھے۔ اس کا قلم ایک کے بعد ایک' خوابوں کا جزیرہ سر کرتا چلا جا رہا تھا ادب کا عام قاری حیران تھا کہ دیکھو جس راستے سے گزرتا ہے پھول اگاتا' چراغ جلاتا چلا جا رہا ہے جتنا سفر طے کرتا ہے اتنا ہی تازہ دم دکھائی دیتا ہے سواد اعظم کے دل میں ندیم کے لئے پیار اور تکریم کے جذبات' اس کی تخلیقات کو ملتا اور درد کے حوالے سے' ندی سے دریا اور دریا سے سمندر بن رہی تھیں۔ مگر "خواص" کے بعض حلقوں میں کچھ اندیشے بھی لرزتے نظر آتے کہ ادب کی عظمت کا اندازہ تعداد سے نہیں' معیار سے کیا جاتا ہے۔

ندیم نے ابھی تک جس رنگ سے جتنا لکھا تھا گو وہ اعلیٰ ادب ہی تھا۔ پھر اس کے فکر و نظر کی خوبیاں اور خوبصورتیاں' ندیم کے ادب کو باقی اعلیٰ ادب سے جدا اور ممتاز بھی کرتی تھیں۔ تاہم برس دو برس میں ایک آدھ غزل لکھنے والے شاعروں کو خدشہ تھا کہ مقدار کا اتنا بوجھ اٹھا کر چلنے سے اس کی کمر دوہری ہو جائے گی۔ اولاد اتنی زیادہ ہو تو وہ توانا و تندرست اور آسودہ خوشحال نہیں رہ سکتی۔ ایک قسم کی مٹی سے بیک وقت کئی مختلف اقسام کے پودے' پھل پھول' درخت اور ترکاریاں اگا کر' ان کی یکساں پرورش کرنا قریب قریب محال امر ہے ان لوگوں میں اکثریت ان اصحاب کی تھی جو خود بھی تخلیق ادب کی توفیق نہیں رکھتے تھے اور دوسرے یہ کہ نسبتاً آرام دہ اور زیادہ منفعت بخش دھندوں کی مصروفیات نے ان کے دل میں تخلیقی عمل کے قرب سے گزرنے کی لگن یا تڑپ بھی باقی نہیں رہنے دی تھی۔ البتہ تنقید کے لہجے میں انگریزی اور فرانسیسی کے چلتے ہوئے جملے خوب چست کر لیتے تھے تو ان کی گنی گیانوں کا قیاس تھا کہ دیکھ لینا آگے چل کر ندیم کی نثر' ندیم کی شاعری سے آگے نکل جائے گی۔ اس کا افسانہ کسی نقطے پر آکر جم جائے گا۔ فقد و نظر کی صلاحیت کسی موڑ پر اچانک بھاگ جائے گی اور شاعری میں تو ایسی خانہ جنگی بپا ہوگی کہ نظم غزل کو اور غزل نظم کو مار کر ہی دم لے گی۔ ان کا خیال تھا کہ ادب کی مختلف چھ سات اصناف اگر ایک ہی صف میں پہلو بہ پہلو "مارچ" کرنے لگیں تو صف سیدھی نہیں رہ سکتی۔ "کامن ویلتھ" کی طرح کے وسیع اور متنوع لشکروں کو پڑاؤ کے بغیر لے کر چلنا' کوئی آسان کام نہیں۔ اس عالم میں تو لکھنے والا بکھر کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ کوئی ٹکڑا یہاں گرے گا' کوئی وہاں' مزید برآں جب ندیم نے کوچہ صحافت میں قدم رکھ کر' صحافت کے "ملک الموت" یعنی روزانہ فکاہی کالم سے بھی پنجہ کشی شروع کر دی تو معاملہ گویا بہت ہی سنگین ہو گیا۔ یہ ہر روز نیا کنواں کھود کر پانی پینے کے مصداق تھا۔ اچھے اچھے اس میدان میں اترے

مگر دوسروں کو ہنساتے ہنساتے بیچاروں کی اپنی ہی گھگھی بندھ گئی۔

یہ اندیشے اپنی جگہ پر کچھ غلط نہ تھے' ندیم کے ظرف و ذہانت سے کمتر آدمی واقعی ادب میں ٹانک ٹوئیے مارنے لگتا۔ میں تو اسے ندیم کے حوصلے' استقامت کار' فن سے اس کے عشق اور اس کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کا معجزہ کہوں گا۔ کہ اس نے جس صنف میں بھی قلم اٹھایا' نہ صرف یہ کہ اس کی روایت کو چار چاند لگا دیئے۔ بلکہ اس کے راستے میں فن و فکر کے نئے نئے چراغ بھی روشن کرتا چلا گیا حد یہ ہے کہ وہ صحافت کو بھی ادب کی سطح پر لے آیا۔ جلال اور جمال اس کے فن کے دو توام جذبے یا مظاہر ہیں۔ مگر جمالیات میں اس کا وجدان و احساس اتنا لطیف اتنا متوازن اور دلفریب ہے کہ الفاظ ان کے قلم سے پھول بن کر برستے ہیں۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ندیم اس دور کی عظیم ادبی شخصیتوں میں سے ہیں۔ گزشتہ آٹھ دس برسوں میں اس حقیقت کا اعتراف دلوں سے گزر کر زبانوں پر بھی آگیا ہے۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ جو شخص زندگی ہی میں "شخص" سے "شخصیت" بن جائے وہ اس انداز میں بات کرتا ہے جیسے وہ کسی اونچے مینار سے نیچے میدان میں کھڑے لوگوں سے مخاطب ہو مگر ندیم کا انکسار بڑھتا جا رہا ہے' مجھے ان سے اب گاہے گاہے ادب کے "ہوائی اڈوں" یعنی مشاعروں میں یکجائی کا موقع مل جاتا ہے۔ اسی اکتوبر میں جب واہ چھاؤنی کی افسر کلب نے ان کے اعزاز میں ایک شام کی تقریب آراستہ کی تو ہم دونوں نے کرنل شیر محمد شاد کے گھر میں ایک پوری شب عمر رفتہ کو آوازیں دینے میں گزاری۔ مجھے تو آج کا ندیم بھی وہی ندیم معلوم ہوتا ہے جو تیس برس پہلے مجھے ریواز ہوسٹل میں ملا تھا۔ بلکہ یہ شاخ اثمار شیریں سے جس قدر بھرتی جا رہی ہے۔ اتنی ہی جھکتی جا رہی ہے۔ پچھلے دنوں جب میں یہ سطور لکھ رہا تھا۔ صدر پاکستان نے عظیم منگلا ڈیم کا افتتاح کیا تھا۔ ندیم کے تذکرے میں جب نگاہ اس کی تخلیقات کی رنگارنگی کی طرف جاتی تو ذہن "منگلا" کی طرف بھی منتقل ہو جاتا۔ اور مجھے ندیم کی ذات بھی ادب و تہذیب کا ایک عظیم "منگلا ڈیم" معلوم ہوتی۔ چند مماثلتیں دیکھئے۔

منگلا ڈیم اور ندیم

منگلا تعمیر کا کارنامہ ہے۔	ندیم' تخلیق کا سرچشمہ ہے
منگلا ڈیم نے دریا کو تسخیر کیا۔	ندیم' نے دلوں کو تسخیر کیا
منگلا زمینوں اور کھیتوں کو سیراب کرے گا۔	ندیم' دلوں اور خیالوں کو سیراب کر رہا ہے۔
منگلا سے چھ سات نہریں نکلیں گی۔	ندیم کی چھ سات نہریں چل رہی ہیں۔
منگلا عظیم الشان منصوبہ ہے۔	ندیم' عظیم الشان انسان ہے۔

میری دعا ہے کہ خداوند رحیم و کریم خشت و سنگ کے "منگلا ڈیم" اور ادب و تہذیب کے "منگلا ڈیم" ——— ہمارے ان دونوں عظیم سرچشموں کو مدتوں سلامت رکھے کہ یہ دونوں ہمارے عزم اور ہماری آبرو کی علامات ہیں۔

یہ مضمون نومبر 1967ء میں گورنمنٹ کالج راولپنڈی کی ایک تقریب کے لئے لکھا گیا تھا۔ آجکل زیر تعمیر تربیلا ڈیم مکمل ہونے پر منگلا ڈیم سے بڑا آبی ذخیرہ ہوگا۔ مگر میں نے مضمون کا عنوان تبدیل کرنا مناسب نہ سمجھا علامت کی معنویت ایک دوامی چیز ہے۔ (ض جنوری 1976)

مینار پاکستان

ایک انتباہ اور ایک التماس شروع ہی میں گوش گزار کر دوں۔ انتباہ یہ کہ ہماری گزارشات کسی قدر طویل ہو سکتی ہیں اور بے ربط تو یقیناً ہوں گی کہ آخر یہ صدارتی خطبہ ہے۔ صدر بلا وجہ چڑچڑا بھی ہو سکتا ہے' خواہ وہ ہم سا ہی صدر کیوں نہ ہو۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم مسند صدارت سے بولنے لگیں۔ حاضرین گرامی سے یہ مودبانہ التماس ہے کہ جناب احمد ندیم قاسمی کو ——— اس پذیرائی پر ——— مبارک باد (بلکہ مبارک بادیاں) پیش کرتے ہوئے اس فقیر ضمیر کو نہ بھول جایئے گا۔ ندیم صاحب کو تو اس سے کہیں زیادہ بڑے بڑے ——— جلیل و جمیل اعزازات مل سکتے ہیں کہ کوئی ادبی اعزاز ان کی قامت کے برابر نہیں۔ مگر میرے لئے تو اس تقریب کی صدارت فضیلت مآب چوہدری فضل الٰہی کی پاکستان کی صدارت سے کم نہیں۔ چنانچہ اس "تمغہ ندیم" کے بعد مجھے ادب کے کسی "تمغہ یتیم" کی ضرورت نہیں۔

خواتین و حضرات!

ہم یہاں حضرت احمد ندیم قاسمی کی نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط عہد ساز ادبی تخلیقات کے اعتراف میں ان کی خدمت میں خراج تحسین پیش کرنے کیلئے جمع ہوئے ہیں۔ یہاں تک تو صیغہ جمع متکلم کے "ہم" اور آپ اکٹھے دست بدست شامل تھے۔ مگر آئندہ جہاں جہاں' "ہم" آئے گا' اور انشاء اللہ بکثرت آئے گا' اس کا اشارہ تنہا "ہماری" طرف ہوگا۔ کیونکہ صاحب صدر اگر پھوس کا بھی ہو تو' اخبارات کے

مدیران کی طرح صیغہ واحد متکلم کی بے تکلفی برداشت نہیں کر سکتا۔ خواہ اپنے بارے میں خود ہی بات کر رہا ہو۔ خیرات کی طرح تعظیم بھی گھر ہی سے شروع ہوتی ہے۔

ابھی ابھی ہم نے "خراج تحسین" کی بات کی تھی۔ اس خاندان کا ایک دوسرا لفظ "ستائش" ہے۔ دونوں کے مزاجوں میں کچھ فرق تو ہے۔ مگر ہمارے ہاتھ آگر یہ دونوں لفظ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلیں گے۔ کیونکہ ہمیں احمد ندیم قاسمی شخص اور احمد ندیم قاسمی شاعر کی ایک ہی سانس میں بات کرنی ہے۔ تحسین شاعر کی' ستائش شخص کی۔ اور ان دونوں سے ہماری وابستگی اب نصف صدی کا قصہ ہے۔

ایک مکتبہ فکر کے نزدیک کسی فن کار سے یہ مطالبہ نہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنی عملی زندگی میں بھی ویسا ہی نظر آئے جیسا وہ اپنی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ "عملی اور عائلی زندگی" کی بنیاد پر کسی تخلیق کار کی عزت و مرتبے کا فیصلہ کرنا بھی قرین انصاف نہیں۔ نطشے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے بیش تر "نطفے" قحبہ خانوں کی نذر ہوتے رہے۔ بالخصوص جب وہ اپنے ملک کی "پنجاب یونیورسٹی" میں اکتساب علم کر رہا تھا۔ خود ہمارے ہاں --- بعض ایسے اہل قلم گزرے ہیں --- اور --- گزر رہے ہیں کہ ان کو --- "برتو" --- تو جی ان کے قریب جانے سے ابا کرے مگر ان کو پڑھو دل ان کی پرستش میں بچھ بچھ جائے --- لیکن صاحبو! اگر کوئی اچھا فنکار --- اچھا انسان بھی ہو تو کیا یہ کوئی بڑی بات ہوگی --- ندیم خیر اتنا بھی "غلط" نہیں ہے کہ اس میں کوئی غلطی ہو ہی نہیں۔ مگر ایک گہری وسیع اور رضاکارانہ انسانی ہمدردی --- خوش دلانہ و مخلصانہ مروت و عالی ظرفی --- جو ایک اندرونی آواز کی تعمیل میں ہے --- ان کی شخصیت کی ایک بڑی دلکشا اور روشن چھاپ بن چکی ہے۔

اور اب
آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

ان سے گفتگو کرتے ہوئے اکثر محسوس ہوا کہ بہترین نتائج عموماً نرم لفظوں سے مرتب ہوتے ہیں۔ شائستگی میں وہ ایک مثالی سفارت کار سے صرف اس قدر مختلف ہیں کہ سفارت کار بات کرتا ہے تو کچھ کہتا نہیں۔ مگر ندیم کی گفتگو ابلاغ کا آبشار ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں ان کتابوں کا شمار مشکل ہے جو ندیم کے "غلیپ" کے بغیر "فلاپ" ہو جاتیں اور اس عہد کے ایسے قدآور ادبی اثمار کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کا قلم انہی کے قلم کا لگایا ہوا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد کے بعد ندیم قاسمی کے علاوہ اردو ادب کا کوئی اور اتنا بڑا "نیاریا" میرے علم میں نہیں ہے جو ریت میں سے سونے کے خال خال ناروں اور ذروں کو الگ کرنے کے لیئے --- چھانٹی لئے ادب کے بہتے دریا کے کنارے بیٹھا ہو۔

ہمارے ایک دوست نے ایک مرتبہ ان کے بارے میں کہا کہ ندیم صاحب نے زندگی کو بہت کچھ سکھایا مگر زندگی سے ایک بات خود نہیں سیکھی۔ وہ ہے --- "نہ کہہ سکنا" --- انہوں نے کہا تھا۔

"HOW TO SAY NO"

یہ ہمارے دوست کی بھول تھی۔ پورا ندیم ان کے سامنے نہ تھا۔ ندیم کے اندر صرف کبوتر یا خرگوش ہی نہیں ہے۔ وہ --- نہیں کہنے پر بھی خوفناک حد تک قادر ہیں۔ مگر ندیم کی "نہیں" --- یاروں کے لئے نہیں ہوتی۔ شہریاروں کے لئے ہوتی --- جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا۔ ان کی "نہیں" کا ایک "دھماکہ" ملک کے اہل قلم نے پورے پاکستان کے دانشوروں کی کانفرنس میں --- جنرل ضیاء الحق جیسے آمر صدر مملکت کے سامنے دیکھا تھا۔ مجموعی طور پر --- میری دانست میں --- وہ "نفی" میں نہیں --- انسانی خیر کے حوالے سے --- "اثبات" میں یقین رکھتے ہیں۔ مگر ان کے بارے میں یہ بات بھی اتنے ہی یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ندیم نے نہ جانے کتنی چیزوں کے لئے اپنی کتنی خواہشوں کو قربان کر دیا ہوگا لیکن اپنی آزادی اظہار کے حق کو کسی قیمت پر قربان نہیں کیا۔

ہم --- بہشت قوم --- نہ کوئی بات ثابت کرنے کے قائل ہیں نہ کسی چیز کو سالم رکھنے کے عادی۔ مگر ندیم صاحب کی فراخ شرکی کے ضمن میں اس تقریب کو بھی ایک تازہ ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جس کو میں نے اپنے لئے " تمغہ اعزاز" کہا تھا--- مجھ سپاہی کو اس موقعے پر ایک جلیل القدر سپاہی صوبیدار خداداد خان کا واقعہ یاد آگیا۔ پہلی جنگ عظیم میں ان کو وکٹوریہ کراس کا اعلیٰ ترین اعزاز ملا تو قیصر ہند' ملک معظم حضور جارج پنجم نے لندن کے قصر بکنگھم میں یہ تمغہ بہ نفس نفیس اپنے ہاتھوں سے صوبیدار صاحب کے سینے پر آویزاں کیا۔ صوبیدار صاحب جب سینے پر تمغہ لٹکائے لندن سے چکوال میں اپنے گاؤں بھوچھال کلاں واپس آئے تو علاقہ کے لوگ جوق در جوق مبارک باد دینے آنے لگے۔ جو کوئی آتا یہی کہتا کہ --- "بادشاہ سلامت نے آپ کا بڑا' آدر" کیا --- بڑی عزت افزائی کی" ------ کچھ دن تو

صوبیدار صاحب لوگوں کی ------ "بادشاہ سلامت' بادشاہ سلامت" سنتے رہے آخر تنگ آکر ایک شخص کی ------ "بادشاہ سلامت" پر اس سادہ لوح سپاہی نے جو تاریخی جواب دیا' وہ "ریکارڈ" کے لائق ہے۔ صوبیدار صاحب اپنا "وکٹوریہ کراس" بجاتے ہوئے بولے ------- "بھراؤ! میرا آدر تو جب ہوتا اگر بادشاہ سلامت میرے گھر آکر مجھے تمغہ دیتے۔"

صاحبو! آپ دیکھ رہے ہیں کہ ادب و شعر کے اس تاجدار نے ------ میرے گھر آکر ------ مجھے اپنے "صدارتی تمغے" سے نوازا۔

قومیں -------- گھروں سے مضبوط اور دانشوروں سے معزز ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دانشور کی بصیرت لوگوں کی اجتماعی دانائی سے زیادہ خیال انگیز ہوتی ہے۔ مگر ہم نے گھروں کو تو اتنا مضبوط کر لیا ہے کہ پورے ملک کی عمارت متزلزل ہو چلی ہے۔ مگر علوم و فنون میں اپنے اہل کمال کی پذیرائی میں مجرمانہ غفلت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم کے بارے میں ------ جاننے "سے زیادہ نہ جاننے" پر زور دیا جا رہا ہے۔ اندریں حالت یہ بڑی غنیمت کی بات ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان نے اس فرض کی سمت میں ایک روشن پیش رفت کا آغاز کیا ہے۔ اللہ اکادمی کے ارادوں میں برکت اور استقامت دے۔ مشورہ دینا سب سے آسان کام ہے۔ سو' ایک مشورہ بھی دیتے چلیں۔ وہ یہ کہ دس مستحق افراد کا اس پذیرائی سے محروم رہنا اس سے بہتر ہے کہ کسی ایک غیر مستحق شخص پر یہ اعزاز نچھاور کر دیا جائے۔ پھر اکادمی کے لئے اپنا ذاتی ہدیۂ تحسین و تشکر ابتدا میں پیش کرنا واجب تھا' مگر میں بھی آخر اسی قوم کا فرد ہوں کہ جس کو جو کام پہلے کرنا چاہیئے وہ عموماً بعد میں کرتی ہے۔

عظیم ترک صوفی شاعر یونس ایمرے نے کہا ہے کہ اولیاء اللہ ------ مراتب کے لحاظ سے ------ چوالیس درجات رکھتے ہیں۔ اس سے آپ ادبا و شعراء کے درجات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ رباعی سے لے کر غزل کے درمیان کم سے کم بھی ایک سو چوالیس درجات تو یقیناً وارد ہوتے ہوں گے اوپر سے خوش فہمی کا یہ عالم کہ جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے -------- اولیا اللہ کے بارے میں تو ہم نعوذ باللہ یہ تصور تک نہیں کر سکتے کہ وہ کہنی مار کر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہوں گے مگر شعراء کرام تو الا ماشاء اللہ جتنی عرق ریزی ایک دوسرے کا راستہ روکنے میں کرتے ہیں' اتنی کاوش اپنے فن پر نہیں کرتے جس طرح ہمارے صنعت کار اتنا روپیہ مصنوعات پر خرچ نہیں کرتے جتنا سرمایہ مصنوعی اور گمراہ کن اشتہار بازی پر صرف کرتے ہیں۔ یہاں پر ہمیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ندیم صاحب ولایت شعری کے اس مقام تک کچھ آسانی سے نہیں پہنچے۔ خیر وہ جہاں بھی ہیں' وہاں پڑاؤ کر سکتے ہیں' قیام کرنے والے نہیں۔

میں نقاد نہیں ہوں کچھ ہوں بھی تو اس فن کے ان مختصصین میں سے نہیں ہوں کہ ندیم کو اس سے زیادہ سمجھا سکوں' جتنا خود سمجھتا ہوں۔ بہرحال کچھ ------ طوطے مینا وغیرہ اڑانے کی کوشش کرتا ہوں۔ کچھ جسارت اس برتے پر بھی کر سکتا ہوں کہ کسی شاعر کے متعلق بات کرنے کا ناحق حق کسی شاعر ہی کو پہنچتا ہے۔ آپ اسے تجزیہ نہ سہی تذکرہ ہی سمجھئے جس طرح مصحفی' شیفتہ' قائم مداہ لکھا کرتے تھے۔ فرائڈ نے کہا ہے کہ یہ جاننا کہ عورت کیا چاہتی ہے۔ ایک مشکل امر ہے۔ اسی طرح ادب و فن کے مطالبات کو جاننا بھی کچھ آسان نہیں ہے۔ میں ذاتی طور پر اعلیٰ شاعری کو ایک ایسی حسین و جواں سال عورت سمجھتا ہوں جو وفادار بھی ہو۔ ندیم صاحب کا معاملہ فن میں اونچائی کے علاوہ ------ چوڑائی اور لمبائی کے حوالے سے کچھ اور زیادہ مشکل ہو گیا ہے کہ جتنا انہوں نے لکھا ہے لوگوں نے اتنا پڑھا نہیں۔ اور پھر لکھا بھی ایسا کہ پڑھنے کے لائق۔ ان کی نظم' غزل' قطعات' ------- افسانے' تہذیبی مضامین' علمی مقالے' فکاہی کالم ------ کس کس پہلو پر اس مختصر فرصت میں کوئی جائزہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ وہ تو یہ کہیے کہ انہوں نے سائنس کا رخ نہیں کیا' ورنہ وہ سائنس کو بھی آرٹ بنا دیتے۔ شائد یہ ان کے لئے ضروری بھی نہ تھا کہ آرٹ تو شروع ہی سائنس کے بعد ہوتا ہے۔ کیونکہ سائنس وہ ہے جو آپ جانتے ہیں اور آرٹ وہ ہے جو آپ نہیں جانتے۔ میں اب جوان بھی نہیں ہوں کہ مجھے سبھی کچھ معلوم ہو۔ میں تو اپنے تاثرات کے حوالے سے ندیم کو اس عہد کے ان اہم اور منفرد شعراء میں سے سمجھتا ہوں جن کی تخلیقات انسانی غفلتوں کی تلافی کرنے اور انسان کو وقت' نسل--- ---- خاندان وغیرہ کے زندانوں سے نکال لینے کی قوت اور صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس کی شاعری زندگی کا ایک دریا ہے' جس میں مختلف دھارے' مختلف سطحوں پر' ایک دوسرے کو چھوتے' اوپر اٹھتے آگے نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی شاعری میں فکر کی ہمت بھی ہے' اسلوب کی رعنائی بھی اور محنت کی حدت و حرکت بھی اور افق کی وہ بے کناری بھی جو

تشنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے آسمان پر ستاروں کا ایک عظیم جھرمٹ دکھائی دیتا ہے مگر ان میں بہت کم ستارے ہیں جو محض حادثاتی طور پر دریافت ہو گئے ہوں۔ ندیم

اگلی صبح کا شاعر اور مستقبل کا صورت گر ہے۔ اس کے اکثر اشعار "کیا" اور "کیوں" کی اکائیں ہیں جن میں سے مستقبل کے وہ خواب جھانکتے ہیں جو ماضی کی تاریخ سے زیادہ بامعنی ہو سکتے ہیں۔ میرے نزدیک وہ ------ اقبال کے بعد ----- ان چند قائدین میں شامل ہے جن کی شاعری میں تاریخ کیا ----- انسانی تقدیر کے خلاف ایک بڑی طاقتور بغاوت کا شعلہ جلتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی شاعری ایک قبر کی ہڈیاں دوسری قبر میں منتقل کرنے کی کاروائی نہیں انسان کے لئے نئے زمین و آسمان دریافت کرنے کا عمل ہے۔ اور یوں وہ اپنے ملک ----- بلکہ اپنے عصر کو ٹھنڈا اور بوڑھا نہیں ہونے دیتا۔ میری ناچیز رائے میں فلسفے کے بغیر عظیم شاعری ممکن نہیں۔ ندیم کے ہاں فلسفہ بھی ہے مگر اس طرح کا گاڑھا نہیں کہ قاری دوزخ کا قرب محسوس کرنے لگے۔ اسلوب اظہار میں لطافت جمال کا یہ مقام اس کے معجزۂ فن کی دین ہے۔ وہ آندھی کی خبر بھی دھنک کے لہجے میں دیتا ہے۔ اس کا فن یقیناً عوام کے لئے ہے مگر عوام کے تابع نہیں ہے۔ اکثر شعراء اپنے اشعار کی اعصابی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے، معماروں کی طرح دیواروں پر پھول پتے چڑھا دیتے ہیں۔ ندیم کے شفاف فن کو اس چھل بل کی ضرورت نہیں۔ حفیظ جالندھری کے بعد ------ الفاظ کا جتنا حسن اور اسلوب کی جتنی موسیقی ندیم کے ہاں گنگناتی ہے، اتنی معنویت کے ساتھ، شائد ہی اس عہد کے کسی شاعر کو نصیب ہو سکی ہے۔ باطنی کیفیات کے علاوہ، جمالیات کے محسوس مظاہر کے اعتبار سے بھی شعر ندیم کا مطالعہ ایک وسیع اور حسین وادی کے رنگا رنگ مناظر میں ریل کے سفر کے مصداق ہے۔ میرے عزیز دوست اور اکادمی ادبیات پاکستان کے موجودہ سربراہ سائیں غلام ربانی آگرو ----- ندیم صاحب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے اپنے لہجے میں مٹھاس کا پورا دریائے سندھ انڈیلتے ہوئے کہا کرتے ہیں کہ یہ شخص تو فرشتوں کی طرح لکھتا ہے۔ ان کی یہ بات بے شک محبت کے مبالغے سے خالی نہیں لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ندیم صاحب کے آس پاس "حوروں" کے "جھرمٹ" دیکھے جاتے ہیں۔ بہرحال، اگر ندیم کی شاعری "جھوٹ" بھی ہے تو ایسا ----- معصوم اور خیال انگیز جھوٹ ہے جس سے سچ نکھر گیا ہے ------ وہ لوگ جن کے دل ------ دنیا کے سکڑنے کے باوجود کشادہ نہیں ہو سکے ------

ندیم کی ترقی پسندی کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے رہتے ہیں۔ ان کی خفگی قابل فہم ہے۔ ان کے نزدیک ندیم کی یہ "لغزش" ناقابل معافی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تمام اختیارات ڈاکٹروں کو منتقل کرنے پر کیوں آمادہ نہیں ہوتا انسان اور کائنات کی گفتگو میں اسلام اور پاکستان کی بات کرتے ہوئے "کراہت" کیوں محسوس نہیں کرتا ------ آج سے کوئی تیس برس پہلے میں نے اپنے ایک مضمون میں ------ احمد ندیم قاسمی کو ----- "اردو ادب کا منگلا ڈیم" ---- کہا تھا وہ تو اس عرصے میں اردو ادب کا "مینار پاکستان" بن گیا ہے۔

"اکادمی" نے اس تقریب کو "شام ملاقات" کے عنوان سے موسوم کیا ہے۔ اس عنوان کی شاعرانہ ملاحت اور رومانیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بجتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر مگر یہ شام تو محبت کا ایک استعارہ ہے۔ ورنہ جناب ندیم تاریخ ادب میں جس مقام پر فائز ہیں، وہاں ----- طلوع صبح او شامے ندارد!!

25 اگست 1991ء کو اسلام آباد میں
"تقریب شام ملاقات" کا صدارتی خطبہ

لندن یونیورسٹی کی تقریب کے دوران بائیں سے دائیں فخر محمد ملک۔ احمد ندیم قاسمی الطاف گوہر افتخار عارف۔

غزل

زندگی کا نقطۂ گماں ہوتا
وہ نہ ہوتا تو میں کہاں ہوتا
اس کی آنکھیں ہیں پیار سے لبریز
کاش یہ لمحہ جاوداں ہوتا
کاش ہوتا مرا بھی گھر کوئی
اور وہ میرا میہماں ہوتا
اس صداؤں کے حشر میں یارب!
کوئی تو میرا ہمزباں ہوتا
عقل پڑتی نہ بیچ میں، تو ندیم
دل کا سودا بہت گراں ہوتا
وہ جو اپنا مزاج داں ہوتا
آدمی کتنا بیکراں ہوتا
ایک ہوتے جو خالق و مخلوق
کیسے ابلیس درمیاں ہوتا
ہم نہ کھاتے اگر فریبِ نظر
چارسُو آسماں کہاں ہوتا
تب ہی کچھ ملتا لطفِ آزادی
مجھ پہ جب میں ہی حکمراں ہوتا
تب مزا آتا زندگی کا ندیم
جو بھی کچھ ہوتا، ناگہاں ہوتا

غزل

چپکے سے فریب کھا لیا ہے
ہم نے ترا بھید پا لیا ہے
گو لُٹ گئے زندگی کے ہاتھوں
ہم نے ترا غم بچا لیا ہے
جب درد اٹھا تو رو دیے ہم
پھر دیر تلک مزا لیا ہے
یاد آئے ہیں جب بھی دن سہانے
اشکوں میں بھی مسکرا لیا ہے
اے گل، تجھے پا ہی لیں گے اک دن
خوشبو سے ترا پتا لیا ہے
خورشید کو جب زوال آیا
ہر چیز نے قد بڑھا لیا ہے
بندوں نے خدا کی جستجو میں
بندوں کو خدا بنا لیا ہے
جیسے ہو ندیم قیسِ دوراں
ہر طفل نے سنگ اٹھا لیا ہے

غزل

جو لوگ دشمنِ جاں تھے، وہی سہارے تھے
منافقے تھے محبت میں، نے خسارے تھے

یہ اور بات، بہاریں گریز پا نکلیں
گلوں کے ہم نے تو صدقے بہت اتارے تھے

خدا کرے کہ تری عمر میں گنے جائیں
وہ دن جو ہم نے ترے ہجر میں گزارے تھے

اب اذن ہو تو تری زلف میں پرو دیں پھول
کہ آسماں کے ستارے تو استعارے تھے

حضورِ شاہ بس اتنا ہی عرض کرنا ہے
جو اختیار تمہارے تھے، حق ہمارے تھے

قریب آئے تو ہر گل تھا خانۂ زنبور
ندیمؔ دور کے منظر تو پیارے پیارے تھے

غزل

خزاں نصیب میں، رشتہ مگر بہار سے بھی
مجھے تو گل کی توقع ہے نوکِ خار سے بھی

مقصر ہوں میں، کہ گنا جاؤں بادگاروں میں
انہیں یہ ضد کہ میں خارج رہوں شمار سے بھی

جہاں بھی جاؤں، اسیرِ حیات رہتا ہوں
یہ مسئلہ تو نہ حل ہو سکا فرار سے بھی

سحر کی کتنی دعائیں خدا سے مانگی ہیں
اب التماس کروں گا جمالِ یار سے بھی

میں مر بھی جاؤں تو تخلیق سے نہ باز آؤں
بنیں گے نت نئے خاکے مرے غبار سے بھی

ندیمؔ وقت کا مرہم نہ میرے کام آیا
کہ زخمِ دل نہ بھرا طولِ انتظار سے بھی

غزل

بچھڑ کے بھی مَیں ترے پرتوِ وصال میں ہوں
جہاں بھی جاؤں، ترے ہالۂ جمال میں ہوں
یقیں نہ آئے تو آئینہ انا میں دیکھ
ترے خیال میں ہوں، تیرے خدوخال میں ہوں
ترے بدن کے سبھی گل کھلائے ہیں میں نے
لہو کی طرح رواں تیری ڈال ڈال میں ہوں
تری تلاش میں عالم عجب نشاط کا تھا
جو تُو ملا تو ترے ہجر کے ملال میں ہوں
سدا کی طرح تری آرزو کمال پہ ہے
یہ اور بات، کہ میں عمر کے زوال میں ہوں

غزل

یہ کیا کہ لمحۂ موجود کا ادب نہ کریں
اگر یہ شب ہے تو کیوں لوگ ذکرِ شب نہ کریں
نہ جانے کفر ہے یہ، یا جنونِ استغناء
ترے فقیر خدا سے بھی کچھ طلب نہ کریں
ترے کمالِ بلاغت سے ہم کو شکوہ ہے
جو گفتگو تری آنکھیں کریں، وہ لب نہ کریں
یہ عرض ہے کہ مرے حال پر مرے احباب
ترس جو کھانے چلے ہیں تو یہ غضب نہ کریں
کہیں وفا سرِ بازار بِک نہ جائے ندیم
کہ اب تو لوگ محبت بھی بے سبب نہ کریں

حواسِ خمسہ

مجھے ایک طفل کے ہاتھ
مٹی میں سَن کے بھی
کبھی پھول
اور کبھی نجوم دکھائی دیں

مجھے سیدھی سادی سی، بھولی بھالی سی صورتیں
نظر آئیں خالقِ حسنِ فن کا کمالِ فن

لبِ مقتدر کے حروفِ نرم کے اس طرف
مجھے کتنی چیخیں سنائی دیں

مرے ہاتھ
کتنی کروڑ آہیں
شبِ خموش کے دامنوں سے نچوڑ لیں

میں گلاب سونگھ کے
اس کو ڈھونڈنے چل پڑوں
جو زمیں کا عطر نکال کر
کسی خس کدے میں، نڈھال
اپنے خدا سے رزقِ حلال مانگتے مانگتے
پڑھے اپنے ہاتھوں کی مٹتی مٹتی عبارتیں

مجھے شہد تلخ لگے
کہ جیسے میں چور ہوں
میں وہ پھل چراتا ہوں
جس میں کتنی مشقّتوں کی مٹھاس ہے

میں کسی بدن کو ہوس کے جبر سے مس کروں
تو مثالِ شعلہ بھڑک اٹھوں
کہ امانتوں میں خیانتوں کی ندامتوں کا خیال
ایک الاؤ ہے
جو کسی طرح بھی تپش کی حد کو نہ کم کرے
جو ضمیر تک کو بھسم کرے

تسلسل

(سیلاب کے تناظر میں)

اب کے برسات عجب طور سے گزری مجھ پر
بارشِ سنگ نے دھرتی کو دھنک ڈالا ہے
بوندیں یوں گرتی ہیں
فولاد کی چادر پہ چٹانیں جیسے
دور تک پھیلتی وسعت میں
جو تصویریں بنائی تھیں کسانوں نے
ہری، زرد، سنہری، بھوری
اُن میں دَر آئی ہیں معصوم لہو کی دھاریں
اور انسان
وہ تخلیق کا شہکارِ عظیم
اس کے تو چیتھڑے اڑتے ہوئے دیکھے میں نے
کچھ بزرگوں نے یہ ارشاد کیا ہے
کہ یہ سب قہرِ خداوندی ہے
—— اور کل خواب میں جب
خالقِ ارض و سما سے مری مڈبھیڑ ہوئی تو میں نے
سجدے کے بعد، ادب سے یہ شکایت کر دی
—— "تو فقط قہر نہیں، مہر بھی ہے
پھر یہ شاداب زمینوں کے اُدھڑتے ہوئے بخیے کیا ہیں"
—— اور آفاق در آفاق
اُمڈتی ہوئی آواز کی یہ گونج سی
دامانِ سماعت پہ گری

پھول جس شاخ پہ مرجھاتا ہے
پھر اُسی شاخ پہ اُگ آتا ہے

دیوانہ

ایک دیوانۂ کامل، سرِ گلزارِ حیات
ایک انبوہ میں چپ چاپ چلا جاتا ہے
ایک گل ہے کہ بگولے میں اُڑا جاتا ہے
زندگی شور مچاتی ہے کہ "اے دیوانے!
ایسے لمحوں کو تو بچّے بھی نہیں کھو سکتے
اتنے بے حس تو فرشتے بھی نہیں ہو سکتے!"
بڑھتا جاتا ہے وہ دیوانہ آسودہ خرام
اور کہتا ہے کہ —— "اے ہمنفسانِ معصوم!
مجھ کو معلوم ہیں جو راز، تمہیں کیا معلوم!
رک تو جاؤں چمنستانِ جہاں میں، لیکن
میری آنکھوں سے تم آنکھیں تو ملا لو پہلے
مٹھیاں کھول کے پتھر تو گرا لو پہلے

بھیک

تم گداگر کے گداگر ہی رہے
تم نے کشکول تہِ جامۂ بانات چھپا رکھا تھا
اور چہرے پہ انا تھی
جو ہمیشہ کی طرح جھوٹی تھی
وہ یہ کہتی ہوئی لگتی تھی کہ ہم بھیک نہیں مانگیں گے
یعنی مرجائیں گے، لیکن کسی منعم کے درِ زر پہ نہ دستک دیں گے

یہ جو گرتے ہوئے سکّوں کی کھنک چار طرف گونجی ہے
یہ شنیدہ ہے کئی برسوں کی
اور کشکول کا لہجہ بھی وہی ہے جو ہمیں ازبر ہے
لاکھ انکار کرو —— لاکھ بہانے ڈھونڈو
تم گداگر کے گداگر ہی رہے

پابندی

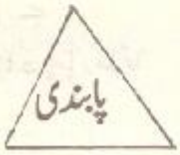

میرے آقا کو گلہ ہے کہ مری حق گوئی
راز کیوں کھولتی ہے
اور میں پوچھتا ہوں، تیری سیاست فن میں
زہر کیوں گھولتی ہے
میں وہ موتی نہ بنوں گا، جسے ساحل کی ہوا
رات دن رولتی ہے
یوں بھی ہوتا ہے کہ آندھی کے مقابل چڑیا
اپنے پر تولتی ہے
اک بھڑکتے ہوئے شعلے پہ ٹپک جائے اگر
بوند بھی بولتی ہے

ایک بیل سے

کھال بہت موٹی ہے تمہاری
سَن سَن کرتے کوڑے کھاؤ
کان ہلاتے جاؤ
درد اگر ہڈی میں اترے
سینگ نہ کام میں لاؤ
دُم کو کَس کَس کر خود اپنی پیٹھ پہ مارو
اور نئے کوڑے کی موسیقی سننے کو
سر نیہوڑاؤ

کھُر سے مٹی کھود کھود کر تال ملاؤ
اور جب ساری کھال اڑ جائے
صرف ذرا سا ڈکراؤ
پھر چپکے سے مر جاؤ!

داورِ حشر ! مجھے تیری قسم
عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
تو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ
میں نے انساں سے محبت کی ہے

کنجِ زنداں میں پڑا سوچتا ہوں
کتنا دلچسپ نظارا ہوگا
یہ سلاخوں میں چمکتا ہُوا چاند
تیرے آنگن میں بھی نکلا ہوگا

*

تیری ہیبت ہے جہانگیر، مگر
تجھ سے تو میں بخدا بہتر ہوں
اُس شہنشہ سے، جو نفرت بیچے
میں محبت کا گدا بہتر ہوں

نہ چھیڑو مجھ سے باتیں خیر و شر کی
میں شاعر ہوں، بس اتنا جانتا ہوں
محبت کا اگر خالق خدا ہے
تو میں ایسے خدا کو مانتا ہوں

*

ذکرِ مریخ و مشتری کے ساتھ
اپنی دھرتی کی بات بھی تو کرو
موت کا احترام برحق ہے۔
احترامِ حیات بھی تو کرو

ممکن ہے، فضاؤں سے خلاؤں کے جہاں تک
جو کچھ بھی ہے انسان کا نقشِ کفِ پا ہو
ممکن ہے کہ جنت کی بلندی سے اتر کر
انسان کی عظمت میں اضافہ ہی ہُوا ہو

*

اپنی آواز کی لرزش پہ تو قابو پالو
پیار کے بول تو ہونٹوں سے نکل جاتے ہیں
اپنے تیور بھی سنبھالو کہ کوئی یہ نہ کہے
دل بدلتے ہیں تو چہرے بھی بدل جاتے ہیں

مقالاتِ ندیم

ایک یک لباس آدمی

احمد ندیم قاسمی

تھرڈ ورلڈ ریستوران کی لمبی چوڑی کھڑکیوں میں لمبے چوڑے شیشے نصب تھے۔ ریستوران کے اندر بیٹھے ہوئے بھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ریستوران کے باہر بیٹھے ہیں۔ یہاں دوسرے ریستورانوں کے مقابلے میں ایک عجیب فراخی کا احساس ہوتا تھا۔ سڑک کا سارا منظر سامنے تھا۔ دوہری کھلی سڑک پر سے گزرتا ہوا ٹریفک' چوڑے فٹ پاتھ پر ٹہلتے ہوئے ہر عمر کے لوگ' کاروں میں سے اترتے ہوئے مرد اور عورتیں اور بچے' ہر کار کے آس پاس منڈلاتے ہوئے ہر صنف کے بھکاری' بجلی کی رفتار سے موٹر سائیکل چلانے والے نوجوان جنہوں نے گردنوں پر اتنے بال جمع کر رکھے تھے کہ عقب سے لڑکیاں معلوم ہوتے تھے ------ غرض سبھی کچھ نظر آتا تھا۔

ریستوران کی آخری کھڑکی کے پاس بیٹھنا میرا معمول تھا۔ چند شامیں مسلسل بیٹھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا تھا کہ بیرونی منظر کے چند کردار ایسے بھی ہیں جو مجھے ہر روز' ایک ہی قسم کے معمول پر کاربند دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو وہ نیلی نیکر والا ملنگی تھا جو بلا ناغہ' دونوں ہاتھوں میں پانی سے چھلکتی بالٹیاں لٹکائے' میرے سامنے سے گزر جاتا تھا۔ وہ مجھے بالٹیوں کے بغیر کبھی نظر نہیں آیا' جیسے بعض لوگ چاندی کے ان چمچوں کے بغیر نظر نہیں آتے جو وہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ایک بوڑھا کنگھیاں بیچنے والا تھا جو کنگھی کم بیچتا تھا اور بھیک زیادہ مانگتا تھا۔ بھیک مانگتے مانگتے اس کی باچھیں مستقل طور پر لٹک پڑی تھیں اور انہوں نے اس کی ٹھوڑی کو جیسے قوسین میں لے لیا تھا۔ ایک روز اس نے ایک گنجے بزرگ کو' جو کار میں سے اتر رہے تھے' ان کی خواتین کے

سامنے کنگھی خریدنے کو کہا تو وہ اس پر جھپٹ پڑے۔ میں لپک کر باہر گیا اور بوڑھے کو ان کی زد سے یہ کہہ کر بچایا کہ کنگھی بیچنا اس کی عادت ہے چنانچہ وہ آگے پیچھے نہیں دیکھتا' بس کنگھی پیش کر دیتا ہے۔

تیسرے مستقل کردار نے مجھے یوں متوجہ کیا کہ وہ مجھے ہمیشہ ایک ہی لباس میں نظر آیا۔ عجیب عجیب تصویروں والی پتلون کے اوپر چوڑی چوڑی سرخ اور نیلی دھاریوں والی بشرٹ! میں ہر روز اس خیال سے اس کا منتظر رہتا تھا کہ ممکن ہے آج اس نے لباس بدل رکھا ہو' مگر وہ ہر روز اسی لباس میں وارد ہوتا۔ جی چاہتا اس سے پوچھوں کہ کیا تمہارے پاس کوئی اور پتلون' کوئی اور بشرٹ نہیں ہے؟ یا چلو شلوار قمیص سہی' دھوتی کرتا سہی ------ مگر اس کے تیور ایسے گمبھیر اور بھرپور تھے اور وہ ہمیشہ اتنا بہت سا سنجیدہ نظر آتا تھا کہ میں اس سے اس کی یک لباسی کا سبب نہ پوچھ سکا۔

کئی بار ایسا ہوا کہ میں ریستوران کی کھڑکی کے پاس کرسی پر جونہی بیٹھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں اس یک لباس شخص کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس کی راہ تکتے تکتے میں پریشان ہو جاتا اور چائے میرے سامنے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو جاتی۔ پھر میں اپنا تجزیہ کرنے لگتا کہ آخر میرا اس کا

رشتہ ہی کیا ہے۔ وہ ایک معمولی درجے کا مزدور ہے۔ وہ دکان کے سامنے' فٹ پاتھ کے حاشیے پر رکنے والی ہر موٹر کار سے مشروبات کا آرڈر لیتا ہے اور انہیں بوتلیں تھما کر ان کے خالی ہونے کا انتظار کرتا ہے۔ پھر جب وہ خالی بوتلیں سمیٹتا ہے اور ان کے دام وصول کرتا ہے تو ایک دو روپے اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے کہ یہ شاید وہ بخشیش ہوتی ہے جسے مہذب زبان میں ٹپ کہتے ہیں۔ کئی بار یوں بھی ہوا ہے کہ رقم وصول کرنے کے بعد اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف نہیں بڑھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے ٹپ کی رقم نہیں ملی۔ تب وہ چند لمحوں کے لئے جیسے سکتے میں کھڑا رہ جاتا ہے اور پیچھے ہٹتی اور پھر تیزی سے مڑ کر غائب ہوتی کار کی طرف یوں دیکھتا رہ جاتا ہے جیسے وہ ابھی پلٹ کر آئے گی اور اسے اس کا حق ادا کر جائے گی۔ مگر پھر وہ دکان پر جا کر خالی بوتلیں اور ان کے دام مالک کے حوالے کرنے کے لئے فٹ پاتھ کی چوڑائی طے کر جاتا ہے۔

کھڑکی میں سے جب بھی کسی کار کو اس طرف کا رخ کرتے دیکھتا تو میرا جی چاہتا کہ وہ پان سگریٹ اور مشروبات کی اسی دکان کے سامنے رکے جہاں یہ سرخ اور نیلی دھاریوں والی بشرٹ میں ملبوس شخص مزدوری کرتا ہے۔ اور جب کوئی کار وہاں رکے بغیر آگے نکل جاتی تو مجھے یوں کوفت محسوس ہوتی جیسے خود میری حق تلفی ہو گئی ہے اس شخص کے ساتھ میں نے جو تعلق خاطر پیدا کر لیا تھا' وہ ایک طرح کی رشتہ داری میں بدلا جا رہا تھا۔ بظاہر عجیب سی بات ہے کہ ایک ریستوران کی کھڑکی سے جو شخص مجھے عموماً نظر آتا ہے' اس کے ساتھ اتنی قربت پیدا ہو جائے مگر یہ قربت آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ مجھے کئی بار یوں بھی لگا کہ مشروبات کی بوتلیں گاہکوں کو دیتے یا واپس لیتے وقت' وہ ایک نظر مجھ پر بھی ڈال لیتا ہے' مگر پھر بھی میں سوچتا ہوں کہ اس رخ پر تو ریستوران کی آٹھ کھڑکیاں ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا ہو۔

ایک روز میں ریستوران میں پورے دو گھنٹے بیٹھا اس کے دکھائی دینے کا انتظار کرتا رہا مگر وہ دکھائی نہ دیا۔ جو کاریں فٹ پاتھ کے حاشیے کے پاس رکتی تھیں' ان سے ایک ٹھگنا سا نوجوان آرڈر لے رہا تھا۔ میں سارا وقت بے چین رہا کہ آخر وہ یک لباس شخص کہاں گیا۔ میں جب ریستوران سے نکلا تو سیدھا مشروبات کی اس دکان پر پہنچا اور اس نوجوان سے پوچھا۔ "یہاں جو شخص روزانہ کام پر آتا تھا اور جس کی جگہ آج تم کام کر رہے ہو' وہ کیوں نہیں آیا؟"

نوجوان بولا۔ "آپ چاچا کریم بخش کا پوچھ رہے ہیں نا؟"

میں نے کہا۔ "مجھے نام معلوم نہیں۔ وہ جو ہمیشہ بڑی بڑی لال اور نیلی دھاریوں والی بشرٹ پہنتا ہے ——"

نوجوان بولا۔ "جی وہی۔ چاچا کریم بخش۔ کبھی کبھی اسے کوئی ضروری کام پڑ جائے یا وہ بیمار ہو جائے تو نہیں آتا۔ آج بھی کوئی ایسی ہی بات ہوگی ورنہ یہی تو چاچے کا روزگار ہے۔"

جی چاہا کریم بخش کا اتا پتا پوچھوں' مگر نوجوان رکتی ہوئی ایک کار کی طرف بڑھ گیا اور میں گھر چلا آیا۔

وہ رات میں نے خاصی پریشانی میں گزاری' جیسے میری زندگی کے معمول میں ایک غیر معمولی رخنہ پڑ گیا ہو۔ میں نے طے کر لیا کہ کل مشروبات کی دکان کے مالک سے کریم بخش کے بارے میں تفصیل معلوم کروں گا اور اس کے گھر جا کر اس کے کسی کام آنے کی کوشش کروں گا۔ مگر دوسرے روز ابھی میں ریستوران میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک کار کے پاس کھڑا' خالی بوتلیں سمیٹتا اور بل وصول کرتا نظر آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی میرے دماغ پر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا اور ریستوراں کے اندر' کھڑکی کے شیشے میں سے کریم بخش کو اپنے روزانہ کے کام میں مصروف دیکھتا رہا۔ ایک دو بار اس نے جیسے میری طرف بھی دیکھا' مگر میرے قریب والی کھڑکی کے پاس بھی تو لوگ بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ممکن ہے کریم بخش نے انہیں دیکھا ہو جبکہ ان میں دو ایسی چمک دار سی لڑکیاں بھی شامل تھیں جن کی طرف پارسا سے پارسا آدمی کی نظریں بھی بے ساختہ اٹھ جاتی ہیں۔

دوسرے روز صبح صبح ہی مجھے راولپنڈی سے فون پر اطلاع ملی کہ ابا جی کو دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ ہسپتال میں داخل کر دئے گئے ہیں۔ میں نے فوراً راولپنڈی کا رخ کیا اور ابا جی کی دیکھ بھال اور پھر ان کی صحت کی بحالی کے انتظار میں مجھے وہاں ڈیڑھ پونے دو ماہ رکنا پڑا۔

واپس آتے ہی شام کو میں نے تھرڈ ورلڈ ریستوراں کی راہ لی۔ میری خاص کھڑکی کے پاس ایک صاحب اور ایک خاتون چائے پینے کے بعد بل ادا کر رہے تھے۔ میں ریستوراں کے اندر چلا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی کاؤنٹر کے پاس بیٹھا منیجر اٹھا' مجھ سے مصافحہ کیا اور بولا۔ "ہم لوگ تو پریشان ہو گئے تھے کہ صاحب کہاں گئے۔ سب کو تشویش تھی مگر یہ باہر پان سگریٹ اور مشروبات کی دکان پر کام کرنے والا چاچا کریم بخش ہے نا'

احمد ندیم قاسمی ہمراہ ایشیا سوسائٹی "نیو یارک" کی بی' آر کراؤن

اس نے تو آپ کے بارے میں پوچھ پوچھ کر جان عذاب میں کر دی۔ نہ جانے اسے آپ سے کیا کام ہے۔ باہر ملاقات ہوئی آپ سے؟"

میں نے کہا۔ "وہاں تو وہ مجھے نظر نہیں آیا۔"

مینیجر بولا۔ "ابھی آجائے گا۔ اس سے ضرور مل لیجئے گا۔ کسی وجہ سے بہت بے چین ہے۔"

جب تک میری نشست پر بیٹھے ہوئے صاحب بل ادا کرنے کے بعد اٹھتے' میں سوچتا رہا کہ اسے مجھ سے ایسا کون سا ضروری کام ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اسے کوئی سفارش درکار ہو۔ شاید اسے اپنا لباس بدلنے کی سوجھی ہو اور اس سلسلے میں اسے کچھ رقم کی ضرورت ہو۔ شاید وہ کسی بہتر روزگار کا متمنی ہو اور اس نے مجھ سے توقعات وابستہ کر رکھی ہوں۔

نشست کے خالی ہوتے ہی میں کرسی پر جا بیٹھا اور باہر نظر ڈالی تو وہی سرخ اور نیلی دھاریوں والی بشرٹ پہنے کریم بخش ایک کار والوں سے خالی بوتلیں اور ان کے دام لے کر پلٹا۔ پلٹتے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ دونوں ہاتھوں میں تھامی بوتلوں سمیت کھڑکی کی طرف یوں جھپٹا جیسے شیشہ توڑ کر اندر چلا آئے گا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے نکل کر' دریا میں آنے والے سیلاب کی طرح' اس کے سارے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ پھر اچانک اس نے ارادہ بدلا' پلٹا اور زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر' اسی ہمہ جہت مسکراہٹ کے ساتھ ریستوران کے اندر آکر میری طرف بڑے تپاک سے بڑھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میرے قریب آکر مصافحے کا وقفہ بھی برداشت نہیں کیا اور بولا۔ "آپ کہاں چلے گئے تھے صاحب جی؟ آپ کہیں بیمار تو نہیں ہو گئے تھے؟ کوئی ضروری سفر کرنا پڑ گیا تھا۔ کیا ہوا تھا صاحب جی؟ آپ کو کیا ہوا تھا؟ سارے چہرے پر آئے ہوئے مسکراہٹ کے سیلاب کے باوجود اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔" میں نے تو ان دنوں جب بھی یہاں آپ کی کرسی پر کسی اور کو بیٹھے دیکھا تو جی چاہا ------ میرا جی چاہا صاحب جی' کہ اس سے کہوں کہ آپ ہوتے کون ہیں یہاں بیٹھنے والے؟ یہاں تو صرف ہمارے صاحب جی بیٹھتے ہیں۔ صاحب جی آپ ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟ ٹھیک ٹھاک ہیں نا آپ؟"

میں سوچ رہا تھا کہ اس اپنائیت اور محبت کی تمہید کے بعد کریم بخش مجھے وہ کام بتائے گا جس کے لئے اسے میرا اتنی شدت سے انتظار تھا' مگر وہ بولا ------- "یہاں تو دن میں سیکڑوں ملتے ہیں صاحب جی' پر پیار سے دیکھنے والی آنکھیں مجھے اس کھڑکی میں سے ہی دکھائی دیتی تھیں ------ اور آج کل کون کسی سے پیار کرتا ہے صاحب جی!"

اقبال ۔۔۔ بحیثیت شاعر

احمد ندیم قاسمی

کل تک یہ ایک عجیب رو چلتی رہی ہے کہ ہم اقبال کو فلسفی کہتے ہیں' مفکر کہتے ہیں' حکیم الامت کہتے ہیں' پیغام بر کہتے ہیں' مگر انہیں شاعر کہتے ہوئے جھجکتے ہیں' حالانکہ وہ شاعر پہلے تھے اور مفکر بعد میں۔ ان کے فکر میں ان کی شاعری ہی نے وہ سحر پیدا کیا جو دوسرے مفکرین میں نہیں ہوتا۔ ان کے پیغام کو ان کی شاعری ہی نے وہ تیور بخشے جن سے دنیائے علم و ادب کے وہ لوگ محروم تھے جن کے پاس اسی انداز کا کوئی پیغام تھا۔ پھر جب یہ ایک حقیقت ہے کہ اقبال کو اقبال شاعری ہی نے بنایا تو انہیں شاعر کہنے میں تکلف کیسا! اور پھر ایسا کیوں ہے کہ اگر کوئی صاحب حوصلہ کر کے اقبال کو شاعر قرار دے بھی ڈالیں تو وہ فوراً بعد یہ بھی ثابت کرنے بیٹھ جاتے ہیں کہ اقبال کی شاعری پر اقبال کا فکر غالب تھا' اور پس ثابت ہوا کہ اقبال شاعر سے کوئی اونچی مخلوق تھے۔

ادھر کچھ عرصے سے لوگ اقبال کی شاعری کی طرف بھی متوجہ ہونے لگے ہیں ورنہ گزشتہ تیس چالیس برسوں میں اقبال پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اس کا مجموعی تاثر' بالواسطہ طور پر' یہ بنتا ہے کہ اقبال تو مفکر تھے' شاعر نہیں تھے' حالانکہ کسی کا شاعر ہونا اس کے لئے باعث ہتک نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ ہمارے معاشرے میں شاعر کو ایک لاابالی' غیر ذمہ دار اور مادر پدر آزاد مخلوق تصور کیا جاتا ہے اور اگر ایک بچہ کوئی شعر موزوں کرلے تو اس کے والدین درگاہوں پر اس تمنا کے ساتھ نیاز بانٹتے چلے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے شاعری کی لت سے محفوظ و مصئون رکھے۔ مگر کیا شاعر واقعی ایسی ہی حقیر اور قابل نفرت مخلوق ہے؟ اگر ہم اپنی تہذیب میں سے میر' غالب' اقبال' وارث شاہ' خوشحال خان خٹک اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کو خارج کر دیں تو کیا ہم قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ ہماری آئندہ نسل ان لوگوں کی نسل نہیں ہوگی جو پتھروں سے صرف اس لئے مختلف ہوتے ہیں کہ پتھر سانس نہیں لیتے؟ شاعر چاہے اسلام کی تبلیغ کرے اور چاہے حسن یار کی باتیں کرے' وہ پڑھنے سننے والوں کے دلوں میں ایک ایسی اہتزازی کیفیت تخلیق کرتا ہے جو ان کی روح میں گداز پیدا کرتی ہے' انہیں حسن و خیر سے متاثر ہونا سکھاتی ہے' انہیں زندگی سے پیار اور انسان کا احترام کرنے کا درس دیتی ہے' اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس درس میں تدریس کا کام شاعر اور شعر کا قاری دونوں مل کر کرتے ہیں' اور وہ بھی تقریر سے نہیں بلکہ محسوسات سے۔ یوں شاعری تو انسان کی کردار ساز ہے' اس فن نے تو انسان کو انسانیت کا عرفان حاصل کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔ یہ شاعری ہی تو ہے جو فنون لطیفہ کی صدر انجمن ہے۔ یونان کتنا ہی گر جائے مگر جب بھی ہومر کا ذکر آئے گا حال و مستقبل کی آنکھیں اس کے سامنے احترام سے جھک جائیں گی۔ انگریز ہم مسلمانوں کے ماضی قریب کی تاریخ کا نہایت سفاک کردار ہے مگر ہم اس کے شیکسپیئر سے محبت کرتے ہیں۔ پاکستان کے سلسلے میں بھارت نے جو روش اختیار کر رکھی ہے' وہ سراسر نفرت کی روش ہے' اور نفرت سے ہمیشہ نفرت ہی پیدا ہوتی ہے' مگر ہندوستان کے کالی داس' میرا بائی اور ٹیگور کے فن کے ساتھ پیار کرنے سے کون کسی کو روک سکتا ہے؟ یہ طلسم سراسر شاعری کا ہے۔ یہ اسی طلسم کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ جنگ کے دنوں میں بھی ہندوستان کے ریڈیو سٹیشنوں سے اقبال کا کلام نشر ہوتا رہا۔ اقبال کو صرف مفکر ثابت کرنے

والوں نے کبھی اس پہلو پر غور کیا ہے؟

فلسفی کے فکر اور شاعر کے فکر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ فلسفی کا فکر شعور و ادراک اور دلیل و منطق کے سہارے بڑھتا اور پھیلتا ہے' شاعر کے فکر کی راہیں جذبے اور احساس' عشق اور وارفتگی' نغمگی اور سر خوشی کی وادیوں میں سے گزرتی ہیں۔ فلسفی دماغ کو اپیل کرتا ہے اور شاعر دل کو۔ مگر کتنا ستم ہے کہ جب یار لوگ اقبال کے فکر کا جائزہ لینے بیٹھتے ہیں تو اس فکر کے شعری حسن سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر اقبال صرف مفکر ہوتے تو انہیں بحر و وزن' ردیف و قافیہ اور صوت و آہنگ کے جھمیلوں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ انہوں نے اپنے نظام فکر کے لئے صرف صنف نثر کیوں اختیار نہ کی؟ انہیں جب صرف یہ کہنا تھا کہ پوری کائنات مسلسل ارتقا پذیر ہے تو انہوں نے یہی کیوں نہ کہا؟ یہ کیوں کہا کہ:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دما دم صدائے کن فیکون

یہ جو اقبال نے اس شعر کے دوسرے مصرعے میں لفظ و معنی کو یک جان کر دیا ہے' اگر کوئی شخص اس مصرعے کا مفہوم نہ بھی سمجھے تو اسے یہ احساس ہو جاتا ہے کہ کچھ بن رہا ہے' کچھ بدل رہا ہے' کچھ تخلیق ہو رہا ہے' اور یہی شاعری کا جادو ہے جس کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ سو جب تک کسی مفکر شاعر کی شاعرانہ عظمت کو سمجھا سمجھایا نہ جائے' اس کے فکر کے ساتھ کماحقہ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ غلط فہمی بہت قدیم اور بہت افسوس ناک ہے کہ شاعری میں فکر در آئے تو شعر کے جمالیاتی مطالبات شاعر کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق ہے' فارسی میں عرفی نے اور اردو میں غالب اور اقبال نے یہ مفروضہ صد فی صد غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ محمد حسن عسکری نے ایک بار فراق کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کچھ اس قسم کی عبارت لکھی تھی کہ ان کی شاعری میں دھنک کے ساتوں رنگوں کے علاوہ وہ "خشکی" بھی موجود ہے جو بڑی شاعری کے لئے ضروری ہوتی ہے' کیونکہ بڑی شاعری شاعرانہ نہیں ہوتی' اس کے لئے معروضیت' انفعال اور "خشکی" ضروری عناصر ہیں ——— اس خشکی سے محمد حسن عسکری کی مراد فکر سے ہے تو مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے۔ شاعری کا تو اعجاز ہی یہی ہے کہ وہ فکر کی خشکی کو بھی گوارا بنا دیتی ہے۔ شاعر کے ہاں اگر فکر شعر میں ڈھل کر بھی خشک ہی رہے تو یہ شاعر کا عجز ہے۔ البتہ جن لوگوں کے نزدیک شعر اور فکر کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہیں اور جو مولانا حسرت موہانی کی شاعری سے آگے کچھ دیکھ ہی نہیں پاتے' ان کے لئے فکر بہر صورت خشکی کے مترادف ہوگا۔ جیسے غالب کے اس شعر میں:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم' یا رب!
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یا اقبال کے اس شعر میں:

تو نے یہ کیا غضب کیا' مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اقبال یقیناً ایک ایسے شاعر ہیں جن کے ہاں قطعی طور پر ایک واضح نظام فکر موجود ہے۔ ان کے فکر کا سراغ لگانے کے لئے نہ ان کے شعروں کو نچوڑنا پڑتا ہے اور نہ ان کے کسی خیال کی تاویل کی جا سکتی ہے۔ انکے ابتدائی کلام کو چھوڑ کر (جو ان کی مشق سخن کا دور ہے) ان کی پوری شاعری اسی نظام فکر کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے باوجود اقبال نے فن شعر کے جمالیاتی مطالبات سے کبھی صرف نظر نہیں کیا۔ یوں مفکر شاعروں میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا ہے کہ اتنی دو ٹوک بات کہنے کے باوجود وہ شاعری رہتے ہیں۔ جن لوگوں کو اقبال کے کلام میں کہیں کہیں "خشکی" نظر آتی ہے' وہ نہ تو فکر کی خشکی ہے اور نہ وہ شعر کہتے ہوئے شاعری کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دینے کی "خشکی۔" یہ خشکی اقبال کی "ڈکشن" سے قاری کی عدم واقفیت اور اقبال کے منفرد انداز بیان سے اجنبیت کی پیداوار ہوتی ہے۔ جس قاری کے ذہن میں یہ خیال جاگزین ہے کہ شاعری صرف روایتی اردو غزل کی زبان ہی میں کی جا سکتی ہے اور جسے امیر و داغ کی زبان سے مختلف نہیں ہونا چاہیئے' اسے تو اقبال کا یہ شعر بھی خشک ہی معلوم ہوگا:

آگ بجھی ہوئی اِدھر' ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

اور پھر یہ انداز بیان:

مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبرئیل آشوب
سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

اس انداز بیاں سے کتنا مختلف ہے:

یہ کس کے نام نے لے لی زبان میں چٹکی
کہ بے قرار ہوئیں شوخیاں بیاں کے لئے

(ریاض خیر آبادی)

کل پاکستان انجمن ترقی پسند مصنفین کانفرنس منعقدہ کراچی کے موقع
پر احمد ندیم قاسمی اپنے ایک (مرحوم) دوست ایوب احمد کرمانی کے ساتھ (1952)

پھر اقبال پر "خشکلی" کا یہ الزام اقبال کے بیش تر نقادوں پر بھی عائد ہوتا ہے جو اقبال کو بحیثیت فلسفی و مفکر پیغامبر تو سیکڑوں بار دیکھ چکے ہیں مگر حقیقی اقبال کی طرف بھولے سے بھی نہیں دیکھتے ------ وہ اقبال جو شاعر ہے' جس کے پاس سب سے بڑا سرمایہ اس کا جذبہ اور احساس اور خیال ہے' جو خیال کو شعر کا لبادہ پہناتے وقت الفاظ کے در و بست' ان کی نغمگی اور مفہوم میں ان کی صوت سے اضافے پر بڑی محنت کرتا ہے اور جو ایک لمحے کے لئے بھی نہیں بھولتا کہ وہ شاعر ہے۔ شاعر جو حسن کار ہوتا ہے۔ ممکن ہے اقبال کی شاعری کو پردۂ اخفا میں رکھنے والے اپنے اس فعل کا جواز اقبال کے اس قسم کے شعروں میں تلاش کریں کہ:

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے' شاعری کیا ہے

مگر یہ جواز بے معنی ہوگا کیونکہ ہمارے ہاں اقبال سے بھی بڑے قلندر گزرے ہیں مگر ان کی شہرت اقبال کی شہرت سے لگا نہیں کھاتی۔ اور اقبال کو یہ بے مثال شہرت ان کی شاعری نے دی ہے۔ شعرا چاہے کسر نفسی سے کام لیں اور چاہے تعلی سے' ان کی اس نوع کی باتوں کو ان کے فن کی کسوٹی نہیں بنانا چاہیئے۔ آخر غالب نے بھی تو کہا تھا:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

مگر کون نہیں جانتا کہ در حقیقت شاعری ہی غالب کا "ذریعہ عزت" قرار پائی۔ سو نقاد حضرات سے' اور خاص طور پر ماہرین اقبالیات سے' میری گزارش ہے کہ وہ شاعر اقبال کی شاعری پر بطور خاص توجہ فرمائیں۔ اقبال کے فکر کو یقیناً عام ہونا چاہیئے کہ وہ ارتقائے انسانی اور احترام و وقار آدمیت کا فکر ہے۔ مگر اس اقبال کو لوگوں سے چھپانا نہیں چاہیئے جو خواب بھی دیکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس اقبال کو پس منظر میں رکھنا اقبال کی شاعرانہ عظمت سے کھلی دشمنی کے مترادف ہے۔ ہمیں اقبال کو میر' غالب اور حالی کی صف میں شامل کرنے سے ڈرنا نہیں چاہیئے کہ وہ اسی صف کے ایک قد آور فرد ہیں۔ انہیں مجدد الف ثانی اور جمال الدین افغانی کی صف میں بھی بے شک شامل کیجئے مگر یاد رکھیئے کہ ہمارے دور کے اس مجدد کے لب پر نغمہ ہے۔

اقبال کے ساتھ انصاف کیجئے

احمد ندیم قاسمی

وہ کون ہے جس کا شعور ذرا سا بھی بیدار اور ذوق ذرا سا بھی نکھرا ہوا ہو اور "ضرب کلیم" کا مطالعہ کرتے ہوئے علامہ اقبال کا یہ شعر اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں نہ لے لے:

دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مردہ
پوشیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے

اس شعر میں مروجہ ظالمانہ نظام معیشت اور استحصال و جبر سے اٹے ہوئے نظام زرعی نے جس بھرپور اور ہمہ گیر انداز میں اظہار پایا ہے' وہ کسی معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس شعر کے لفظ لفظ میں اور اس کے مفہوم کی پرت پرت میں اقبال کی وہ شخصیت بول رہی ہے جسے اگر غیر ملکی حکومت کے دنوں میں عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھا گیا تو اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے' مگر جسے آزاد پاکستان پر ربع صدی تک حکومت کرنے والوں نے بھی بڑے التزام کے ساتھ چھپایا ہے۔ وہ ادارے اور گروہ جو ایک منصفانہ اور عادلانہ نظام معیشت کے مطالبے میں بھی غیر ملکی سیاسی نظریات کے جراثیم دریافت کر لیتے ہیں' معیشت کے بارے میں اقبال کے قطعی طور پر واضح اور نہایت غیر مبہم نظریات کو ہمارے حکمرانوں کی طرح ناپسند فرماتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بھی نصف اقبال کی ترجمانی و تشریح کو اپنا وتیرہ بنائے رکھا اور باقی نصف کے متعلق کسی نے ذرا سی بھی گفتگو کا حوصلہ کیا تو اسے گردن زدنی قرار دے دیا۔

میری ان معروضات کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے' قیام پاکستان کے بعد اب تک اقبال کا یہ شعر ایک بار بھی ریڈیو سے نشر نہیں ہوا اور ٹیلی وژن کی سکرین اس شعر سے مستقل طور پر محروم رہی۔ میں سوچتا ہوں آخر اس شعر میں ایسی کون سی ناگفتہ بہ بات کہی گئی ہے جو ان اداروں اور گروہوں کی طبع نازک پر گراں گزرتی ہے اور اس لئے انہوں نے اقبال کے اس لاجواب شعر کو اقبال کے کلام میں سے عملاً خارج کر رکھا ہے جب کہ یہ شعر فیوڈل شکنجے میں جکڑے ہوئے کسان کے روز و شب کی اتنی دلدوز تصویر ہے کہ مجھے دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہر زبان کی شاعری اور ادب میں کسان کی مظلومیت کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر صرف دو مصرعوں کے سولہ الفاظ میں جاگیرداری نظام کی پوری کارفرمائی اور اس کے نتائج کو سمو دینا اقبال کے سے عظیم شاعر ہی کا کام تھا۔

ذرا اس شعر کی تصویر کو اپنے سامنے لائیے کہ ہمارا دہقان زندہ نہیں ہے' ایک مردے کی مثال ہے جسے اس کی قبر نے بھی قبول نہیں کیا اور اسے اگل کر باہر پھینک دیا ہے۔ مگر اس مردے کا کفن زیر زمین دفن پڑا رہ گیا ہے' اس لئے دہقان' جو بظاہر زمین پر ہل چلا رہا ہے اور دھرتی کی کھدائی کر رہا ہے' دراصل اپنے کفن تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ محنت کی بے ثمری کا ایسا لرزا دینے والا اظہار پڑھنے والے کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ انسانی محنت کو باوقار بنانے کی کوشش کرے اور محنت کو وقار بخشنا اور اس کا احترام کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود اسی "گناہ" کی پاداش میں علامہ اقبال کے اس شعر سے عوام الناس کو محروم رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے تاکہ ان کے ذہنوں میں اپنے حقوق کا احساس نہ پیدا ہونے پائے اور وہ روز و شب کی محنت سے زندگی کی آسائشیں اور آسودگیاں حاصل نہ کریں بلکہ محض کفن حاصل کرنے کے لئے اپنی زندگیاں گنوا دیں۔

مگر' جیسا کہ میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں' علامہ کے تو آدھے سے زیادہ کلام کو لوگوں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے ایک طویل منصوبے پر برسوں تک عمل ہوتا رہا ہے' اور ستم یہ ہے کہ اس کے منصوبہ کاروں

میں ارباب حکومت و سیاست کے علاوہ بعض ارباب علم و ادب اور بعض ارباب تعلیم تک شامل تھے۔ پاکستان کے پہلے عام انتخابات کی تیاریوں کے دنوں میں ٹیلی ویژن کی طرف سے علامہ کا ایک شعر عرصے تک ناظرین کو دن میں دس دس بار پڑھایا جاتا رہا۔ شعر یہ تھا:

تری خاک میں ہے اگر شرر، تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

شعر کی عمدگی میں کلام نہیں مگر جس نیت سے اس شعر کی تکرار کو ضروری سمجھا گیا، وہ کسی صورت میں نیک نہیں تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اے اہل پاکستان! افلاس و امارت اور محنت و سرمایہ کی بحث فضول ہے کیونکہ اگر تمہارے اندر ایمان کا شرر موجود ہے تو فقر و غنا کا خیال مت کرو کہ آخر حیدر کرارؓ کی قوت کا مدار جو کی روٹی پر تھا! اس شعر کو عوام کے افلاس اور اس پر صابر و شاکر رہنے کے جواز کے طور پر پیش کرنا علامہ اقبال کے نظریات کے ساتھ کھلی زیادتی ہے۔ اس شعر میں تاکید "نانِ شعیر" کھانے کی نہیں ہے، اپنی خاک میں ایمان و یقین کے شرر کو زندہ رکھنے کی ہے۔ اسی لئے تو ایک اور جگہ علامہ اقبال نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ:

جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے
اسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

علامہ اقبال کی ایک اور محبوب اصطلاح "فقر" کے ساتھ بھی یار لوگوں نے جی بھر کے بدسلوکی فرمائی ہے۔ یوں وہ علامہ اقبال کے کلام کے جس حصے کو لوگوں کی نظروں سے باآسانی نہیں چھپا سکتے، اس کی اپنے انداز میں تاویل کر لیتے ہیں اور "فقر" کے حوالے سے عوام کو اپنے افلاس پر قناعت کرنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس علامہ اقبال نے جگہ جگہ وضاحت کر دی ہے کہ ان کے فقر کا مفہوم "بے دستی و رنجوری" نہیں ہے، ایک شان استغنا ہے جو اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرتی کہ "سلطنت روم و شام" کا حصول اس کے منافی نہیں ہے۔ مروجہ معیار فقر کے بارے میں علامہ واضح طور پر کہتے ہیں (اور واضح طور پر کہنا ان کا اسلوب ہے، انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ:

رمز و ایما اس زمانے کے لئے موزوں نہیں
اور آتا بھی نہیں مجھ کو سخن سازی کا فن

ان کا سا بڑا سخن ور تو خیر اس صدی میں پیدا ہی نہیں ہوا مگر وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ وہ غیر مبہم انداز میں بات کرنا پسند کرتے ہیں):

میں ایسے فقر سے، اے اہلِ حلقہ، باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دستی و رنجوری

علامہ کے فقر کا معیار تو اس نوعیت کا ہے:

تو کہ کھویا گیا، تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مالِ فقیر، سلطنتِ روم و شام

علامہ جب یہ کہتے ہیں کہ:

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی، جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا، مکر و فن

تو ان سے مخاطب قوم کے غربا نہیں ہوتے، وہ امرا و رؤسا ہوتے ہیں جو "تن کی دولت" سے بہرہ یاب ہیں اور انہوں نے اپنی زندگیوں کو اسی دولت کے نشے میں "سود و سودا" اور "مکر و فن" کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ روحانی بالیدگی کی اہمیت سے کسی بھی باشعور اور مہذب انسان کو انکار نہیں ہو سکتا، مگر جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا بھی تو ضروری ہے، اور یہی وہ نکتہ ہے جس کو بعض عناصر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ سود و سودا اور مکر و فن کا دھندا ہمیشہ کی طرح آگے بھی چلتا رہے اور علامہ کے اشعار کی تاویل سے عوام کو سمجھایا جاتا رہے کہ "تن کی دولت" کی سی فضولیات سے پرہیز کرو اور روکھی سوکھی کھا کر "من کی دولت" جمع کرتے رہو۔

غربا کو راضی برضا رکھنے کی اس مہم میں علامہ کا یہ شعر بھی بہت افراط سے استعمال ہوا ہے بلکہ چند برس پہلے بعض سرکاری دفاتر میں اس شعر کو بطور طغریٰ آویزاں کیا جاتا رہا:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے، دل یا شکم؟

مگر اس شعر کے مخاطب بھی وہ امرا ہی ہیں جن کے قلب و ضمیر کو زر و سیم کی چٹان ہمہ وقت دبائے اور چھپائے رکھتی ہے۔ چنانچہ صرف شکم کے بندے بن کر وہ دل کے اعتزاز سے محروم رہتے ہیں اور اس دولت کی صورت میں اپنے لئے سامان موت اکٹھا کرتے رہتے ہیں جو انہیں "دل" کے مطالبات پورا کرنے کی مہلت ہی نہیں دیتی۔ اس شعر کے، یا اس طرح کے دوسرے اشعار کے، مخاطب وہ لوگ کیسے ہو سکتے ہیں جو تہی شکمی کی وجہ سے ہمہ وقت موت سے دوچار رہتے ہیں!

علامہ کے ان اشعار کے مطالب ان کے کئی دوسرے اشعار سے

بھی واضح ہوتے ہیں' مثلاً وہ فرماتے ہیں:

تری نگاہ فرومایہ' ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ؟

دنیا کی نعمتیں تیرے سامنے موجود ہیں مگر تو انہیں دیکھ ہی نہیں پاتا۔ دیکھتا ہے تو ان تک تیرا ہاتھ نہیں پہنچ پاتا' اس لئے کہ تو نے اپنی رسائی کو محدود اور اپنی بصارت اور بصیرت کو مسدود کر رکھا ہے۔ ان نعمتوں کی مثال کھجور کے اس بلند درخت کی سی ہے جو پھلوں سے لدا کھڑا ہے مگر ان تک پہنچنے کے لئے سب سے پہلے تو تجھے یہ درخت دریافت کرنا ہے اور اس کے بعد اس کی بلندی کو طے کر کے اپنی محنت کے ثمرات کو اپنی دسترس میں لانا ہے۔

"سوال" کے عنوان سے ایک قطعہ میں علامہ کہتے ہیں:

اک مفلسِ خود دار یہ کہتا تھا خدا سے
میں کر نہیں سکتا گلہ دردِ فقیری
لیکن یہ بتا تیری اجازت سے فرشتے
کرتے ہیں عطا مردِ فرومایہ کو میری؟

اس قطعہ میں تو علامہ نے شاعرانہ زبان کا بھی کوئی پردہ نہیں رکھا' کسی استعارہ سازی یا پیکر آفرینی سے بھی کام نہیں لیا۔ ایک خوددار مفلس کی زبان میں وہ صاف صاف پوچھتے ہیں کہ امارت و ثروت میں صرف مردان فرومایہ ہی کیوں قابض ہیں؟ یاد رکھنے کی بات ہے کہ علامہ نے یہاں صرف "گلہ فقیری" کا نہیں' "گلہ درد فقیری" کا ذکر کیا ہے۔ یہ فقیری وہ کرب ہے جس کا اظہار فقیر مناسب نہیں سمجھتا مگر کرب ناقابل برداشت ہے اس لئے وہ اس کا اظہار کر بھی دیتا ہے کہ الٰہی! آخر کیا سبب ہے کہ میرے ایسا خوددار تو زندگی کی معمولی آسائشوں سے بھی محروم ہے اور مردان فرومایہ کو آسودہ زندگی کی ہر سہولت میسر ہو؟

ایک اور شعر میں علامہ نے ان "مردان فرومایہ" کی بڑی موثر تصویر کھینچی ہے:

وہ شے کچھ اور ہے' کہتے ہیں جانِ پاک جسے
یہ رنگ و نم' یہ لہو— آب و ناں کی ہے بیشی

وہ اپنے مخاطبین کو خبردار کرتے ہیں کہ یہ جو امرا کے چہروں پر چمک دمک ہے تو اس سے اس طرح کا دھوکا کھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ ان کی روحانی تابندگی کا پرتو ہے! یہ تو محض جی بھر کر مرغن کھانے اڑانے اور دیگر ہر قسم کی مادی سہولتوں سے بہرہ یابی کا نتیجہ ہے۔ یعنی ان لوگوں کی تو صرف صحت اچھی ہے' ان کی روح بے چاری تو مرض الموت میں مبتلا ہے۔

مسئلہ یہ ہو کہ علامہ نے شکم پر روح کی فوقیت پر زور دیا ہے' یا یہ ہو کہ علامہ انقلاب برپا کرنے کے لئے سب سے اول ذہنی انقلاب برپا کرنے کے حامی ہیں' اس حقیقت کو کوئی طرار سے طرار تاویل بھی نہیں جھٹلا سکتی کہ علامہ موجودہ زر پرست معاشرے کو کسی صورت اور کسی پہلو سے بھی برقرار رکھنے کے موید نہ تھے۔ وہ قومی وسائل پر چند افراد کے قبضے سے شدید نفرت کرتے تھے اور یہ قطعی نہیں مانتے تھے کہ فاقہ روحانی طہارت کی بنیادی شرط ہے۔ جن افراد یا اداروں کو علامہ اقبال کے ارشادات سے یہ توقع ہے کہ ان میں کہیں نہ کہیں انہیں استحصالی نظام معیشت کے حق میں کوئی دلیل مل جائے گی' خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ علامہ کے اشعار کو ان کے سیاق و سباق سے الگ کر کے دیکھنے کا طرز عمل صرف وقتی طور پر ان کی ڈھارس بندھائے گا' ورنہ اس ضمن میں علامہ کے نظریات بالکل واضح اور غیر مبہم ہیں' اور علامہ کا یہی تو کمال ہے کہ ان کا کلام اپنی تاویل نہیں کرنے دیتا۔

متعلقہ موضوع پر علامہ کی براہ راست قسم کی نظموں میں ایک نظم "فرمان خدا" بہت مشہور ہے اور بچے بچے کی زبان پر ہے۔ چند برس پہلے ایک محترم بزرگ نے یوم اقبال کی تقریب پر اس نظم کے بارے میں اپنی طرف سے "انکشاف" فرمایا تھا کہ خدا کا یہ فرمان تو فرشتوں کے نام ہے' خدا کے بندوں نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو اس فرمان کا مخاطب سمجھ لیا ہے۔ خدا تو فرشتوں سے اس قسم کی باتیں کر رہا ہے کہ:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

یقیناً اس نظم میں خدا نے یہ فرمان فرشتوں ہی کے نام جاری کیا ہے لیکن اگر فرشتوں کا معبود --- آدم --- ان احکام کو خود ہی پورا کرنے پر کمر باندھ لے تو کیا وہ اس طرح خدا کے حضور میں گستاخی کا ارتکاب کرے گا یا احکام خداوندی بجا لا رہا ہوگا؟ کیا خدا کی اس دنیا کے غریبوں کو جاگنے کے لئے فرشتوں کی طرف سے جھنجھوڑے جانے کی ضرورت ہے؟ کیا کاخ امرا کے در و دیوار کو ہلانے' چڑیوں کو بازوں سے لڑانے' سلطانی جمہور کو قریب لانے اور اس کی راہ میں حائل ہونے والے ہر نقش کہن کو مٹانے' محنت کش کو اس کی محنت کے صلے سے محروم رکھنے والے کھیت کو جلانے اور خدا اور بندے کے درمیان فصیل کی طرح ایستادہ "پیران کلیسا" کو "کلیسا" سے رخصت کر دینے کے لئے خدا کے بندوں کو خدا کے فرشتوں کا انتظار کرنا چاہئے؟ اور کیا حق بات یہ نہیں ہے کہ جب خدا کے بندے حق و انصاف کی قدروں کے احیا کے اس مبارک کام میں مصروف ہوں گے تو خدا کے فرشتے ان کے مدد و معاون ہوں گے --- کیونکہ یہ بندے وہ کام کر رہے ہوں گے جو فرشتوں کے کرنے کے ہیں؟ فرشتوں کے نام اس قدر مثبت اور اتنے انقلابی فرمان میں سے ابن آدم غائب نہیں ہے' اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ موجود ہے۔

سرمایہ داروں اور بڑے زمینداروں کے ہاتھوں خلق خدا کے استحصال کے سلسلے میں اگر علامہ کے نظریات کو سمجھنا ہو تو صرف "بال جبریل" ہی میں ان کی نظمیں "گدائی" اور "الارض للہ" اور "ساقی نامہ" اور "لینن خدا کے حضور میں" پڑھئے۔ "گدائی" میں وہ اپنے "شہر کے والی" کے بارے میں فرماتے ہیں:

تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے؟
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا؟
اس کے آبِ لالہ گوں کی' خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا!
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے؟ مردِ غریب و بے نوا!

"الارض للہ" کے آخر میں علامہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں (اور اس میں وہ بڑے زمیندار --- وہ خدا --- سے مخاطب ہیں):

وہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں' میری نہیں!
تیرے آبا کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں!

اس کے باوجود یہ کیا ستم ہے کہ علامہ کے اشعار استحصال کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لئے پیش کئے جاتے ہیں اور اس اقبال کو چھپایا جاتا ہے جو یوں نعرہ زن ہوتا ہے:

حدیثِ بے خبراں ہے' "تو با زمانہ بساز"
زمانہ با تو نسازد' تو با زمانہ ستیز

ن م راشد کے انتقال پر احمد ندیم قاسمی حلقہ ارباب ذوق میں صوتی غلام مصطفےٰ تبسم کی صدارت میں راشد پر مضمون پڑھ رہے ہیں۔

ادیب اور مملکت

اہل قلم کانفرنس 1980ء کا کلیدی خطبہ

احمد ندیم قاسمی

پاکستان میں ادیب اور مملکت کا مسئلہ پچیس تیس برس پہلے حتمی طور پر طے پا چکا تھا۔ اب اگر قیام پاکستان کے سوا تینتیس برس بعد بھی اکادمی ادبیات پاکستان اس مسئلے کا احیاء چاہتی ہے اور اسے ایک بار پھر زیر بحث لانا چاہتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ تو یقیناً نہیں ہے، مگر اس سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ ہم کسی اہم قومی مسئلے کے بارے میں کوئی فیصلہ کر ہی نہیں پاتے اور اگر کسی فیصلے تک پہنچ بھی جاتے ہیں تو اس فیصلے پر ہمیں اعتماد نہیں ہوتا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ آزادی کے اتنے برس بعد بھی ہم خود اعتمادی کی نعمت سے بہت حد تک محروم ہیں، ورنہ اتنے اہم مسائل کو ہم ہمیشہ سیال حالت میں کیوں رکھتے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد ادیب اور حکومت، ادیب اور ریاست، ادیب اور مملکت، ادیب اور وطن کے عنوانات کے تحت روزناموں، ہفت روزوں اور ادبی جریدوں میں ایک بہت طویل اور ہمہ گیر بحث کا آغاز ہوا تھا۔ اس بحث میں کہیں کہیں تلخی بھی پیدا ہوئی تھی۔ کافر سازی اور غدار بازی کا سلسلہ بھی چلا تھا مگر آخر کار بحیثیت مجموعی طے پایا تھا کہ کسی بھی خطہ زمین میں حکومت تو آنی جانی ہوتی ہے کیونکہ حکومت تو ریاست یا مملکت کو چلانے کا ایک انتظامی ڈھانچہ ہوتا ہے جو بدلتا رہتا ہے اور بدلا جا سکتا ہے، البتہ حکومت کے مقابلے میں مملکت ایک قائم و دائم حقیقت ہے اور اس کا قیام اور دوام، ادیب کا ایمان ہے اور ایمان بدلا نہیں کرتے۔

دنیا کے دوسرے نو آزاد ممالک میں بھی ادیب اور مملکت کے موضوع پر اہل ادب اور اہل فن کے درمیان مکالمہ ہوتا رہا لیکن پاکستان میں اگر اس مکالمے نے غیر معمولی طول کھینچا تو اس کے بعض منطقی اسباب تھے۔ پاکستان ایک نئی مملکت تھی جسے برصغیر کے مسلمانوں کی ایک تاریخ ساز تحریک نے، ایک تاریخ ساز شخصیت کی رہنمائی میں قائم کیا تھا اور یوں ایک تاریخ ساز شاعر اور مفکر کے ایک خوبصورت خواب کی تعبیر کو مملکت پاکستان کی صورت میں متشکل کر دیا تھا۔ بحث یہ تھی کہ کیا سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں کوئی مملکت مذہب کی بنیاد پر بھی قائم ہو سکتی ہے۔ سوال اٹھانے والوں کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ اسلام دیگر مذاہب عالم کے مقابل میں سراسر مختلف مذہب ہے۔ اسے سائنس اور ٹیکنالوجی سے کوئی بیر نہیں ہے کیونکہ وہ تو کائنات بھر میں صداقت کی جستجو کو مسلمان کا منصب اور حق قرار دیتا ہے۔ یہ ایک ضابطۂ زندگی ہے۔ ایک نظریۂ حیات بھی ہے اور کیا آج کی ترقی یافتہ دنیا نظریاتی مملکتوں سے خالی ہے؟ کیا یورپ اور امریکہ کی جمہوریت ایک نظریہ نہیں ہے؟ کیا روس اور چین کی اشتراکیت ایک نظریہ نہیں ہے؟ پھر جب تین چوتھائی کرہ ارض پر نظریاتی مملکتیں ہی قائم ہیں تو اگر ایک خطہ ارض کے مسلمانوں نے ایک ایسی مملکت قائم کی ہے جس میں وہ اپنے عقاید، اپنی اقدار اور اپنی روایات کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو اس پر اتنی عالمگیر حیرت کا کیا مفہوم ہے؟ پاکستان کے معترضین سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو انہوں نے علامہ اقبال کے ہاں پناہ لینے کی کوشش کی کہ دیکھئے، علامہ تو وطن اور وطنیت کے تصورات ہی کے مخالف تھے اور وہ تو اسلام کو حدود و ثغور سے بالا سمجھتے تھے اور وہ تو سید جمال الدین افغانی کی طرح مسلمانان عالم کو ایک ملت واحدہ کی لڑی میں پروئے نکلے تھے۔ عرض کیا گیا کہ علامہ نے حب وطن کو ہر انسان کا ایک فطری جذبہ بھی تو قرار دیا ہے۔ وہ دراصل وطن اور وطنیت کے ان جارحانہ تصورات کے مخالف تھے جو یورپ میں رواج پا رہے تھے اور جن کی مبالغہ آمیز صورت بعد میں فسطائیت کے گھناؤنے روپ میں ظاہر ہوئی جس نے چھ برس تک کی طویل عالمی جنگ میں کرہ ارض کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہ وہ وطنیت ہے جس کا بنیادی تصور نسلی برتری کا ہے پھر دوسری قوموں سے نفرت و حقارت کا۔ اور بحمد اللہ مسلمان کی وطنیت ان تصورات سے آلودہ نہیں ہے کیونکہ اسلام تو نسل و رنگ کے امتیازات کا دشمن ہے اور امن، سلامتی اور سکون کا علم بردار ہے۔ پھر جب علامہ اقبال مسلمانوں کی ملت واحدہ کا نظریہ پیش کرتے ہیں تو ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بحالات

موجود مسلم ممالک اپنی جغرافیائی انفرادیتوں کو برقرار رکھتے ہوئے، ایک عالمی مجلس ممالک اسلامیہ کی تشکیل کر سکتے ہیں جو مسلم ممالک سے تعاون، یک جہتی اور بھائی چارے کے قرآنی منشور پر عمل کرائیں اور یوں عالمگیر مسلم برادری کی منزل کی طرف قدم بڑھائیں جو آخر کار عالمگیر انسانی برادری کی شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔

ظاہر ہے مملکت پاکستان کے معترضین کے پاس اس دلیل کا بھی کوئی جواب نہیں تھا اس لئے ادیب اور مملکت کے مکالمے یا مباحثے کا زور کم ہو گیا اور پھر آہستہ آہستہ ختم ہو گیا، مگر چند ہی برس پہلے کسی کو یہ نکتہ سوجھا کہ اب پاکستان میں نظریہ پاکستان کی بحث شروع کی جائے، حالانکہ نظریۂ پاکستان تو پاکستان سے پہلے طے پا چکا تھا۔ یہ ایک بین منطقی حقیقت ہے کہ نظریۂ پاکستان پہلے پیش کیا گیا اور پاکستان کا قیام بعد میں عمل میں آیا۔ تحریک پاکستان نے اسی نظریۂ پاکستان ہی سے توانائی اور رہنمائی حاصل کی تھی۔ میں تحریک پاکستان میں ذاتی طور پر ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے شامل تھا اس لئے مجھے علم ہے کہ جن عناصر نے اس زمانے میں اس تحریک کی نہ صرف کوئی حمایت نہ کی بلکہ بس چلنے پر مخالفت تک کر ڈالی، وہ آج نظریہ پاکستان کے سب سے بلند آہنگ حمایتی ہیں۔ میں ان عناصر کے رویے میں اس تبدیلی کا خیر مقدم کرتا ہوں اور ان کی دیانت پر کسی شبے کا اظہار نہیں کرتا کیونکہ میں ادیب ہوں اور ادیب خیر و برکت اور عفو و درگزر کی روایات کا نمائندہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جس طرح یہ طے ہے کہ یہاں کا ادیب بہرصورت اور بہرحالت مملکت پاکستان کا وفادار ہے، اسی طرح یہ بھی طے ہے کہ وہ نظریہ پاکستان سے غیر وفاداری کا رویہ اختیار کر کے اپنی مملکت کی جڑوں پر کلہاڑا چلانے کا تصور بھی کرے تو اس کے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں۔ البتہ تخن گسترانہ بات صرف یہ ہے کہ پاکستان کے ادیب کا نظریۂ پاکستان وہی ہے جو اس نے قائد اعظم اور علامہ اقبال سے سیکھا ہے اور قائد اعظم اور علامہ اقبال مسلمان تھے اور قرآن پاک کے فرمانوں اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر ان کا ایمان پختہ اور غیر متزلزل تھا۔ چنانچہ ادیب اور مملکت پاکستان کے موضوع پر مکالمے کی طرح، ادیب اور نظریۂ پاکستان پر مباحثہ بھی عملاً ختم ہو گیا اور اگر اب تک کہیں کہیں اس پر گفتگو ہو رہی ہے تو محض کافر سازی اور غدار بازی کی سہولت پیدا کرنے کے لئے ــــــ ورنہ جو مسائل و معاملات طے شدہ ہوتے ہیں، ان پر بحثیں برپا کرنا محض وقت کا زیاں ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ ادیب سے مملکت پاکستان اور نظریہ پاکستان سے وفاداری کا بار بار مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے، جب کہ نظریہ پاکستان اور مملکت پاکستان کو ہم سب کی مشترکہ وفاداری ہی نے جنم دیا اور ہم سب نے اسے قائم رکھا ہے اور ہم سب اسے قائم رکھیں گے۔ اور جب میں ""ہم سب"" کے الفاظ استعمال کرتا ہوں تو ان میں شاعر اور ادیب اور مصور اور موسیقار بھی شامل ہوتے ہیں بلکہ ان کی شمولیت اس لئے کچھ نمایاں ہی رہتی ہے کہ پاکستان کی روحانی قدروں کے محافظ یہی لوگ ہیں۔ یہی لوگ قوم کے مزاج کی گہرائیوں میں اترتے ہیں، قوم کے خد و خال ابھارتے ہیں، قوم کے ایک منفرد تشخص کی تشکیل کرتے ہیں، وہ اپنے ہم قوموں کی روحانی اور تہذیبی اور معاشی اور معاشرتی اور سیاسی امنگوں کے نباض ہوتے ہیں اور پھر ان کا اظہار کرتے ہیں ــــــ کسی پابندی یا سنسر کی وجہ سے بلا واسطہ اظہار نہ کر سکیں تو بالواسطہ اظہار کرتے ہیں۔ مگر اظہار ضرور کرتے ہیں۔ وہ اظہار نہ کریں تو دم گھٹ کر مر جائیں۔ ایسے مجسم وفا لوگوں سے آئے دن نئی سے نئی وفاداریوں کے اعلانات کے مطالبے اور تقاضے ان کے ایمان اور ان کی دیانت پر شبے کے مترادف ہیں۔

مملکت کوئی مجرد تصور نہیں ہے۔ یہ ایک ٹھوس اور محسوس کی جانے والی حقیقت ہے کیونکہ یہ اس کروڑوں کی مخلوق کا حصار عافیت ہے جو اس کے اندر بستی ہے۔ اس مملکت کے اندر بہت کچھ بدلتا رہتا ہے مگر مملکت کا وجود غیر متبدل ہوتا ہے اور اس وجود کا تحفظ ہر باضمیر ادیب کا ایمان ہوتا ہے کیونکہ اسی کے تحفظ میں یہاں کے عوام کا تحفظ پوشیدہ ہے۔ جب ادیب چاہتے ہیں کہ اس مملکت کی حیثیت مثالی ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مملکت سے محبت کرتے ہیں اور اسی محبت کی بنا پر وہ اسے سربلند اور باوقار دیکھنا چاہتے ہیں۔ ادیبوں کو اپنے قومی مسائل کی اہمیت کا بدرجہ اتم احساس بھی ہوتا ہے اور ان مسائل سے تخلیقی سطح پر نمٹنے کا حوصلہ بھی ہوتا ہے اور وہ ان مسائل کے نقوش کو اس لئے واضح کرتے اور ان کے حل کی راہیں اس لئے متعین کرتے ہیں کہ انہیں اس خطۂ ارض اور اس میں رہنے بسنے والوں سے پیار ہے اور وہ اپنی مملکت کو کسی بھی شعبۂ حیات میں، کسی بھی دوسرے ملک سے پیچھے نہیں دیکھنا چاہتے۔ ایسا کرتے ہوئے ان کے لہجے میں تلخی بھی آ سکتی ہے اور ان کی آواز میں کڑک بھی پیدا ہو سکتی ہے مگر تلخی سے چونکنے اور کڑک پر بگڑنے کی بجائے دیکھنے کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ اپنی مملکت کے لئے چاہتے کیا ہیں۔ وہ تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ یہ مملکت ایسی ہو جس میں ان کے سارے خواب حقیقت کی صورت اختیار کر کے پنپ سکیں، جہاں کا ایک ایک فرد خود کفیل اور خوش حال ہو اور

مادی اور روحانی استحصال سے محفوظ ہو' جہاں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو' کوئی بھوکا نہ ہو' کوئی بے روزگار نہ ہو' کوئی بیمار علاج سے اور کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ ہو' جہاں کوئی کسی کا حق نہ ہتھیا سکے' جہاں نفرت کی بجائے محبت کا رواج ہو' جہاں فرقہ پرستی کی بجائے بھائی چارے کی فضا ہو' جہاں منافقت نہ ہو' دشنام بازی اور بہتان طرازی نہ ہو' جہاں کشیدگی کی بجائے باہمی تعاون کار فرما ہو' جہاں بے مقصدیت کی بجائے وہ مثبت مقاصد پروان چڑھیں جن کا ایک واضح رخ اور ایک معین جہت ہو اور جن کا سفر ارتقائی ہو' جہاں مادی اور قلبی اور روحانی سکون ہو اور جہاں تنقید کی آزادی ہو اور یہ تنقید برداشت کی جاتی ہو' جہاں زندگی کا ڈھرا ایسا ہو کہ سب انسان بہترین اخلاقی اصولوں کے مطابق زندہ رہیں اور یہ اصول ان لوگوں کے ایمان اور عقیدے اور مقدس انسانی قدروں اور بلند تہذیبی معیاروں کی برکت سے' ان کے اندر سے' ان کے ضمیر کی گہرائیوں سے ان کی نفسیات و عادات کا قدرتی حصہ بن کر' ان کی شخصیت میں رچ بس کر' خود بخود بے ساختگی کے ساتھ' یوں پھوٹیں جیسے کہسار سے جھرنے پھوٹتے ہیں۔ یعنی یہ سب کچھ ان پر بحکم عاید ہونے کی بجائے ان کے دلوں اور دماغوں میں اترا ہوا ہو ------ اور یہ تعلیم سے ممکن ہے' تربیت سے ممکن ہے' پاکیزہ اور پر سکون ماحول سے ممکن ہے' چھوٹوں کے سامنے بڑوں کے' ایک مثال بن کر زندہ رہنے سے ممکن ہے اور صرف ایسی فضا میں ممکن ہے جہاں ذاتی مفادات پر قومی اور مملکتی مفادات کو بہر صورت اور بہر حالت' صد فی صد فوقیت حاصل ہو اور قومی اور مملکتی مفادات کو ذاتی مفادات کی یلغار سے محفوظ رکھنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ استحصال کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی صورتوں کو یک قلم ختم کر دیا جائے ----- اور اگر ایسا ہو جائے تو نہ علاقائی کشیدگیوں کی گنجائش باقی رہے گی اور نہ مملکت کے مستقبل کے بارے میں شک و شبہ کی ذہنیت عام ہو سکے گی۔ ادیب اگر یہ سب کچھ چاہتے ہیں تو اس کا غیر مبہم مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مملکت سے عشق کرتے ہیں اور چونکہ انہیں اس کی بقا خود اپنی بقا سے بھی بدرجہا عزیز ہے اس لئے وہ اس نظریئے کے بھی وفادار ہیں جس پر یہ مملکت قائم ہے۔

مگر یہ کتنا بڑا ستم ہے کہ کم سے کم ادیبوں کے حوالے سے تو مملکت کے ساتھ وفاداری کا کوئی ایک معیار مقرر نہیں ہے۔ ہر دور میں اس وفاداری کی نوعیت بدل دی جاتی ہے اور اسے ادیبوں کے خلاف بطور سیاسی حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ آج کے کتنے ہی اخباروں کے صفحات گواہ ہیں کہ قومی زندگی میں بدقسمتی سے جتنی بھی گندگی موجود ہے وہ ساری کی ساری اہل ادب اور اہل فن پر ہی انڈیلی جا رہی ہے' جیسے اس مملکت میں گردن زدنی صرف اہل قلم کا طبقہ ہے اور باقی پڑھی لکھی آبادی صرف بے گناہوں اور معصوموں پر مشتمل ہے اور میں عرض کر چکا ہوں کہ پاکستان کے سچ مچ کے تخلیق کاروں کے "گناہ" کیا کیا ہیں ------- یعنی یہی عدل اور انصاف اور حق اور برابری اور توازن کے مطالبے!

ہم ادیبوں کو فخر اور اصرار ہے کہ ہم کسی حکومت کے ترجمان کبھی نہیں رہے۔ ہم صرف اپنی مملکت اور اہل مملکت کے ترجمان ہیں۔ ہم کسی حکومت کی مخالفت محض اس لئے نہیں کرتے کہ وہ حکومت ہے۔ اگر کوئی حکومت اس مملکت کے کروڑوں عوام کو کچھ سہولت' کچھ سکون مہیا کرے گی تو ہم اس کی داد دینے میں بخل سے کام نہیں لیں گے کہ ادب اور بخل کا آپس میں کوئی جوڑ ہی نہیں ہے' البتہ کوئی حکومت جب بھی کوئی غلطی کرے گی ہم اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے ٹوکیں گے کیونکہ مملکت کی قوت اور حشمت میں صرف اس آزادی رائے ہی سے اضافہ ہو گا۔

ہم ادیب اپنی قوم کا ایک ناگزیر اور حساس ترین حصہ ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ادب پیدا کرنے کے لئے محض تخلیقی قوت ہی کی نہیں' بھرپور تخلیقی تجربے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور ہم یہ تخلیقی تجربہ اپنے کروڑوں عوام کے ساتھ مل بیٹھنے سے' ان کے مسائل اور ان کی سوچوں کو سمجھنے سے' اور ممکن حد تک ان کی جہد حیات میں شرکت کر کے حاصل کرتے ہیں کیونکہ اپنے قومی کلچر کو قوم میں جذب ہو کر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم ایک لگن والے باشعور لوگ ہیں۔ یقیناً ایک دور ایسا بھی تھا جب لگن کو جنون و وارفتگی کے مترادف سمجھا جاتا تھا اور اس جنون کو شعر و ادب کا لازمہ قرار دیا جاتا تھا' مگر ہم جانتے ہیں کہ آج مملکت پاکستان کو مجنونوں اور مجذوبوں کی ضرورت نہیں ہے۔ سرمستی و سرشاری کا بھی انسانی زندگی میں ایک مقام یقیناً ہے مگر جس دور میں سے دنیا آج کل گزر رہی ہے اس میں سرمستی و سرشاری فی الحال بے محل ہے ؎

عشق جنوں سہی مگر عشق فقط جنوں نہیں
ہوتے ہیں کچھ مطالبے عشق سے آگہی کے بھی

اگر ہمیں یہ آگہی حاصل نہ ہوتی تو ہمیں کیا پڑی تھی کہ کوئی مل لگانے یا امپورٹ ایکسپورٹ کی کوئی فرم کھولنے یا سمگلنگ کرنے یا ڈاکہ ڈالنے کی بجائے تخلیق ادب کا سا غیر افادی کام کرتے۔ اس مفاد پرست عصر رواں میں اپنی پوری زندگی ایک غیر افادی کام میں بسر کر دینے کا حوصلہ اہل ادب اور اہل فن کے سوا اور کس مخلوق میں ہے؟ ہم ادیبوں میں سے ننانوے فی

صد افراد ایسے ہیں جو دن بھر غیر ادبی کاموں سے کسب معاش کرتے اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں اور راتوں کو دن بھر کی دوڑ دھوپ کی تھکن اتارنے کی بجائے تخلیق شعر و ادب میں مصروف ہو جاتے ہیں یعنی زر پرست معاشرے کی اصطلاح میں ایک غیر افادی کام کرتے ہیں۔ روح اور ضمیر کی تطہیر و تعمیر سے زیادہ غیر افادی کام کیا ہو گا مگر یہی ہمارا کمال اور یہی ہمارا ایثار ہے۔ ہم اپنی مملکت کی تہذیب اور اس کے کلچر کی زبانیں ہیں اور ہمیں اپنے اس منصب پر فخر ہے۔

میں ایک عمر رسیدہ ادیب کی حیثیت سے اعلان کرتا ہوں۔ اور مجھے یہ اعتماد حاصل ہے کہ میرے اس اعلان میں پاکستان کے اہل قلم کی اکثریت کی آواز شامل ہے ------ کہ بحیثیت ادیب ہماری کومٹمنٹ عالم اسلام سے بھی ہے۔ اس عالم اسلام میں بھی انسان ہی بستے ہیں اس لئے ہماری کومٹمنٹ عالم انسانیت سے بھی ہے اور ہماری ان کومٹمنٹس میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے بلکہ یہ سب آپس میں اس طرح مربوط ہیں کہ ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں۔ ہم جب اپنی مملکت سے کومٹمنٹ کا اعلان کرتے ہیں تو اس کے استحکام اور ترقی اور بقا سے بھی کومٹمنٹ کرتے ہیں اور ان آٹھ کروڑ عوام کے بنیادی انسانی حقوق و مفادات سے بھی، جن کا سرگرم اور محنت کش وجود، اس مملکت کا اثبات کرتا ہے۔ مملکت محض تاریخ اور جغرافیے کے نقشوں میں کسی سرحد کی نشان دہی کا نام نہیں ہے بلکہ ہر مملکت وہاں کے عوام سے بامعنی ہوتی ہے۔ البتہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اپنے عوام کے وفادار ہیں اور مملکت سے وفاداری کچھ ضروری نہیں ہے بلکہ یہ وفاداری تو "شاونزم" کی ذیل میں آتی ہے، تو وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ عوام خلا میں نہیں رہتے، ایک مملکت میں رہتے ہیں اور اس مملکت کی سلامتی ہی میں اس کے عوام کی سلامتی ہے، اور ہم ادیب جب اپنی مملکت سے وفاداری کا اعلان کرتے ہیں تو دراصل اس مملکت کے عوام، اس مملکت کی نظریاتی انفرادیت، اس مملکت کی تہذیب، اور اس مملکت کی ہر خوبصورتی سے وفاداری کا اعلان کرتے ہیں اور اس وفاداری میں حکومت سے وفاداری کا کوئی دور دراز کا بھی شائبہ نہیں ہوتا، کیونکہ حکومت کی مثال تو ریل گاڑی کو کھینچنے والے انجن کی سی ہے جس میں اگر کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو اسے بدل دیا جاتا ہے اور ریل گاڑی کا سفر جاری رہتا ہے۔

دائیں سے بائیں۔ سید سبط حسن۔ فیض احمد فیض۔ حمید اختر۔ احمد ندیم قاسمی۔

ادیب اور آزادیِ اظہار

اہل قلم کانفرنس 1985ء کا کلیدی خطبہ

احمد ندیم قاسمی

قیام پاکستان سے لیکر اب تک ادب اور ادیب کو وہ اہمیت کبھی نہیں دی گئی جو ایک مہذب ملک میں دی جانی چاہئے کہ ادب ہی تو کسی قوم کی تہذیب کی پہچان ہوتا ہے اور ادیب ہی تو تہذیب کے خد و خال کا تخلیق کار ہوتا ہے اور وہی تو اہل وطن کے ضمیر کا ترجمان ہوتا ہے۔ ادیب کو سچ بہت سکھائے گئے ہیں۔ اسے تلقینیں بے حد کی گئی ہیں۔ اسے پاکستان سے محبت اور نظریہ پاکستان کی حفاظت کے گر بے شمار سمجھائے گئے ہیں۔ کم ہی کسی نے سوچا ہے کہ پاکستان سے محبت تو پاکستانی اہل قلم کے خمیر اور ضمیر میں رچی ہوئی ہے۔ بس یہ ہے کہ یہ اہل قلم نظریہ پاکستان میں حریت فکر اور آزادیِ اظہار کو بھی شامل سمجھتے ہیں کیونکہ پاکستان فکر و اظہار کے انہی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر حاصل کیا گیا تھا۔ میں نے علمی و ادبی اجتماعوں میں بعض بڑے بڑے ارباب اقتدار اور اہل الرائے کے اس نوعیت کے ارشادات بھی سنے ہیں کہ یہ زمانہ شاعری اور افسانے اور ناول اور ڈرامے کا زمانہ نہیں ہے بلکہ ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے اور اہل ملک کو غزلوں، نظموں اور کہانیوں سے مسحور رکھنے کے بجائے ان کے ہاتھوں میں پلاس تھمانے کا وقت آگیا ہے۔ یقیناً یہ ٹیکنالوجی کا دور ہے مگر کیا ہاتھ میں پلاس آتے ہی انسان گنگنانا بھول جاتا ہے؟ یا کیا اس طرح وہ اچھے اچھے خواب دیکھنے سے دست کش ہو جاتا ہے؟ شعر و ادب تو ٹیکنالوجی کے اس دور میں بھی ذہن کو شاداب، دل کو گداز اور ضمیر کو بیدار رکھنے کا ایک موثر ترین ذریعہ ہیں۔ اگر کسی قوت نے ٹیکنیکل لحاظ سے ترقی یافتہ انسان کو اب تک مشین بننے سے روک رکھا ہے تو یہ شعر و فن اور علم و ادب ہی کی قوت ہے۔ اور پھر سائنس اور ادب میں بعد کہاں ہے۔ سائنس کی ترقی تو شاعر اور ادیب کی قوت متخیلہ کا ایک ٹھوس روپ ہے۔ سائنس دان حقائق اور ان کے امکانات سے سنتا ہے اور فن کار کا زاد سفر جذبہ و احساس اور خیال و خواب ہوتے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ یہ خیال و خواب بھی حقائق ہی کی سرزمین سے پھوٹتے ہیں اس لئے آگے بڑھتی ہوئی انسانیت کے کاروان میں فن کار اور سائنس دان ہمیشہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں کہ سائنس دان ان فن کاروں کے خوابوں کو حقائق میں بدلنے پر مامور ہوتے ہیں۔ یوں اہل دانش کے یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں اور ان میں سے کسی ایک کی نفی کر کے دوسرے کا اثبات ممکن ہی نہیں۔ میرا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ شعر و ادب اور علم و فن کو تہذیبی لحاظ سے ثانوی حیثیت دینا ایک فیشن سا بن چلا ہے اور قومی ہیئت اجتماعیہ میں تو شاعروں اور ادیبوں کے مسائل کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ یہ بڑی تلخ بات ہے مگر حق بات ہے۔

دراصل پاکستان میں ادب اور ادیب کے مسائل کے ساتھ سنجیدگی سے نمٹنے کی کوئی روایت ہی موجود نہیں ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں اعلیٰ شعر و ادب کی کوئی کتاب ایک ہزار سے زیادہ کی تعداد میں شاذ ہی شائع ہوتی ہے بلکہ اس نوع کی بعض کتابوں کو تو پانچ سو سے زیادہ کی تعداد میں چھاپنے کا حوصلہ ہی نہیں کیا جاتا۔ چند برس پہلے کا ذکر ہے، غیر ملکی ادیبوں کے وفد کے ایک رکن نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تمہارے ہاں اعلیٰ ادب کی کتاب کا پہلا ایڈیشن کتنی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔ وطن کے وقار کا مسئلہ تھا اس لئے میں نے دس گناہ دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا اور کہا۔ "دس ہزار کی تعداد میں۔" اس پر اس غیر ملکی نے مجھ سے باقاعدہ بھرائی ہوئی آواز میں اظہار ہمدردی کیا۔ میں سوچتا ہوں اگر میں اس کے سامنے سچ

بول دیتا تو اس کی تو حرکت قلب بند ہو سکتی تھی! بہرحال ہماری یہ ہزار پانچ سو کتابیں بھی اگر سال دو سال میں فروخت ہو جائیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ کتاب کی "ریکارڈ سیل" ہوئی ہے۔ اعلیٰ معیار کے ادبی' فنی اور علمی رسائل بھی ہزار پانچ سو سے زیادہ کم ہی چھپتے ہیں۔ اب غور فرمایئے کہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں خواندگی کا تناسب بیس پچیس فی صد ہے۔ ان میں سے اگر سو میں ایک فرد بھی اعلیٰ ادب کا مطالعہ کرے تو دس کروڑ کے اس ملک میں دس لاکھ ایسے افراد ہونے چاہئیں جو اعلیٰ ادب خریدیں۔ چلئے پانچ لاکھ سہی' ایک لاکھ سہی' پچاس ہزار سہی' پچیس ہزار سہی' دس ہزار سہی' پانچ ہزار سہی ------- مگر جب دس کروڑ کی اس مملکت میں پانچ ہزار بھی ایسے نہیں ہیں جنہیں اعلیٰ ادب کا ذوق ہو تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ پانی کہیں نہ کہیں مر رہا ہے۔ کیا ہمارے ہاں ادب کی تعلیم ناقص ہے؟ کیا ہمارے نوجوانوں کو اعلیٰ ادب پڑھنے کی ترغیب اور تربیت ہی نہیں دی جاتی؟ کیا ہمارے ہاں قوت خرید اتنی کم ہے کہ آٹھ کروڑ میں سے پانچ ہزار افراد بھی کتابیں خرید کر نہیں پڑھ سکتے؟ کیا ہمارے ہاں تخلیقی ادب کا معیار گر رہا ہے؟ ممکن ہے ادب اور ادیب کی بدحالی میں یہ سبھی اسباب شامل ہوں مگر میری رائے میں سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ تہذیب و ثقافت کی ترجیحات کی جو فہرست مرتب کی جاتی ہے' اس میں ادب اس فہرست کی شاید آخری شق ہوتا ہے۔ بصورت دیگر ہمارے ہاں ہزاروں کی تعداد میں سکول ہیں' کالج ہیں' دانش گاہیں ہیں اور ان میں سے ہر ادارے میں لائبریری موجود ہے۔ تعلیمی اداروں کے علاوہ بھی قومی زندگی کے مختلف شعبوں کی اپنی لائبریریاں ہیں۔ اگر حکومت انیس اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں کی معیاری کتابیں اور معیاری رسائل کی خریداری کا پابند کر دے تو چند ماہ کے اندر اعلیٰ معیار کے کتب و رسائل کی تعداد اشاعت ایک ہزار سے بڑھ کر پچاس ہزار تک تو یقیناً جا سکتی ہے اور اگر اہل قلم کی کاوشیں اتنی تعداد میں شائع اور فروخت ہونے لگیں تو ادیب کے معاشی مسائل حتمی طور پر حل ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں نہ حکومت کو وظائف جاری کرنے کی تکلیف کرنی پڑے گی اور نہ اہل قلم میں سے کسی کے مرجانے کے بعد اپیلیں شائع ہوں گی کہ اس کے پس ماندگان کی گزر بسر کا کچھ بندوبست کیا جائے۔ اگر ایک کتاب کی قیمت پچاس روپے ہے اور موجودہ حالات میں یہ کم سے کم قیمت ہے' اور یہ کتاب پچاس ہزار کی تعداد میں شائع ہوتی ہے اور ادیب کو کم سے کم رائلٹی دس فی صد کے حساب سے ملتی ہے اور یہ کم سے کم رائلٹی ہے' تو میری اس گزارش کے حوالے سے ایک کتاب کے صرف ایک ایڈیشن کی رائلٹی ڈھائی لاکھ روپے بنتی ہے۔

مگر اس طرح کے مسائل پر ہمدردی سے غور کم کیا جاتا ہے اور ادیب کو زیادہ شک کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے کیونکہ ادیب ہمیشہ آگے بڑھ کر سوچتا ہے اور جمود اور انحطاط سے کبھی سمجھوتا نہیں کرتا۔ وہ حق بات کہنے سے کبھی باز نہیں آتا' چاہے اپنی بات کو "تشبیہ' استعارہ اور علامت کا لباس پہنا دے۔ یوں وہ بظاہر کم سہی' مگر بباطن عموماً معتوب ٹھہرتا ہے اور اسی لئے اس کے مسائل کو کم ہی لائق اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ مگر ادب اور ادیب کو عملاً نظر انداز کر کے اپنی تہذیب کے خد و خال کو نمایاں کرنے کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ حسن کاری ادیب کا شیوہ ہے اور حسن کا مطلب ہے عدل' خیر اور ارتقاء ------- چلئے ادیب کا نیک مقصد ہی اس کا معاوضہ سہی ۔

ندیم' کوئی مرے فن کا اجر کیا دے گا
میں خاک چاٹ کے بھی نشۂ ہنر میں رہوں!

ڈاکٹر بشیر سیفی کی تحقیقی و تنقیدی کتب

اردو میں انشائیہ نگاری

(تاریخ و تنقید)

دور سرسید سے 1986ء تک اردو انشائیہ نگاری کی تاریخ و تنقید کا بے لاگ محاکمہ

خاکہ نگاری

(فن و تنقید)

پاکستان میں اپنے موضوع پر پہلی کتاب جس میں 1985ء تک لکھے گئے خاکوں کو فن خاکہ نگاری کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے

شعری مجموعے

گفتار مطلع

(غزلیں۔ نظمیں۔ ہائیکو)

(اولیں مجموعہ غزل)

اپنے قریبی بکسٹال سے خریدیئے یا براہ راست ہم سے طلب کیجئے

نذیر سنز پبلشرز 40 ۔ اے اردو بازار ۔ لاہور

اکیسویں صدی عیسوی --- ایک آزمائش، ایک چیلنج

احمد ندیم قاسمی

اکیسویں صدی عیسوی کا استقبال کرتے ہوئے، ہم صرف اس صورت میں بھلے لگ سکتے ہیں کہ ہمارے ذہنوں اور ضمیروں میں ان ناکامیوں اور کامرانیوں کا مکمل احساس و شعور موجود ہو جو بیسویں صدی عیسوی میں ہمارا مقدر تھیں۔ پھر ان ناکامیوں کے اسباب و مضمرات کا قلع قمع کرنے کے پختہ ارادے، اور ان کامرانیوں کو مزید صیقل و تاباں کرنے کے عزم صمیم ہی سے ہم اکیسویں صدی کی طرف اعتماد کے ساتھ قدم بڑھا سکتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ جب دن بھر کی دوڑ دھوپ اور تگ و دو کے بعد تم آرام کرنے کے لئے بستر پر لیٹو تو سونے سے پہلے اپنے اعمال و اقوال کا خود ہی محاسبہ کرو کہ طلوع آفتاب کے بعد اب تک تم سے کون کون سی غلطیاں سرزد ہوئیں اور تم نے کون کون سے اچھے کام کئے، اور پھر اپنے آپ سے یہ طے کرنے کے بعد ہی سوؤ کہ آئندہ تم ان غلطیوں کا اعادہ نہیں کرو گے اور ان اچھے کاموں کو نہ صرف ہمیشہ کے لئے اپنا لو گے بلکہ انہیں مزید نکھارو اور سنوارو گے۔ یہ ایک فرد کی زندگی میں ایک دن کا معاملہ تھا، مگر ایک صدی تو چھتیس ہزار سے بھی زیادہ دنوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کا حساب افراد اور اشخاص کے علاوہ قوموں اور ملتوں کو رکھنا ہوتا ہے، چنانچہ اس کا محاسبہ بھی تو بحیثیت قوم ہمیں کو کرنا ہے کہ رواں صدی میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا، اور کیوں کھویا اور کیسے پایا، اور یہ بھی تو طے کرنا ہے کہ اس صدی میں ہم نے جو کچھ کھویا، اسے نئی صدی میں پانے کی کوشش کریں گے اور اس صدی میں ہم نے جو کچھ پایا، اس کا نئی صدی میں بھی جان سے تحفظ کریں گے --- اس طرح کے کسی فیصلے کے بغیر بیسویں صدی کے بعد اکیسویں صدی ہمارے لئے اسی طرح بے معنی ہو کر رہ جائے گی جیسے ایک شکست خوردہ اور مایوس شخص کے لئے، منگل کے بعد بدھ کا دن بھی منگل کی طرح بے معنی ہوتا ہے۔

ان دنوں صرف ممالک اسلامیہ میں نہیں، بلکہ پورے کرۂ ارض پر احیائے اسلام کے چرچے ہیں۔ یورپ اور امریکہ تک کے برا عظموں میں وہاں کے دانش ور، اور رائے عامہ کو متاثر کرنے والے عناصر، سوچنے لگے ہیں کہ ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کو صدیوں تک اپنے استعمار و استبداد کی گرفت میں اسیر رکھنے کے باوجود، اسلام کا جذبہ، مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں میں کیوں زوال پذیر نہیں ہو سکا اور یہ چار طرف سے اسلام کے بڑھتے ہوئے قدموں کی دھمک سی کیوں سنائی دے رہی ہے، چنانچہ یہ راز معلوم کرنے کے لئے قرآن و حدیث اور اسلامی فقہ اور اسلامی تہذیب کا از سر نو مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ اسلامیات کے سلسلے میں تحقیقی مراکز قائم ہو رہے ہیں اور مغرب کے متعصب مورخین کی پھیلائی ہوئی تاریکی سے بچ کر، اسلام کو حقیقت و صداقت کی روشنی میں پرکھا اور جانچا جانے لگا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اسلام کے

سے سچے، کھرے، پاکیزہ اور منصفانہ ضابطہ حیات کا مطالعہ بے تعصبی کی فضا میں ہوگا تو مطالعہ کرنے والوں کا اسلام سے متاثر ہونا، ناگزیر ہو جائے گا، چنانچہ یورپی اور امریکی ممالک میں ہزاروں لاکھوں افراد متاثر ہو رہے ہیں اور الحاد اور بے یقینی اور بے مذہبیت کی دھند میں سے، فی الحال وہ خود نہیں تو، ان کے دل اور دماغ ضرور نکلتے آ رہے ہیں۔ یہ اسلام کی عالمگیریت کے واضح امکان کا ایک بلیغ اشارہ ہے، مگر اس مبارک امکان کو صرف اس طرح حقیقت میں بدلا جا سکتا ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے مسلمان اپنی زندگیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات عالیہ کے سانچے میں ڈھال لیں، دلوں پر سے توہمات کی گرد جھاڑ دیں، عقاید کو مصفّٰے اور منزّہ کر لیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی تمثالیں بن جائیں۔ اکیسویں صدی میں اگر ہم مسلمان اپنے اندر صحیح اور سچا اسلامی انقلاب پیدا کر لیں تو وہ مقدس و مبارک خواب بھی ہمکنار تعبیر ہو سکتا ہے جو سید جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال نے بیسویں صدی میں دیکھا تھا۔ یہ کرۂ ارض کے تمام مسلمانوں کے ایک امت ---- ایک ملت بن جانے کا خواب ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام میں ملوکیت کے در آنے سے اس دین فطرت کو کتنا شدید نقصان پہنچا اور مسلمانوں کے مزاج، ابتدائی صاف ستھرے اسلامی سانچوں کو توڑ کر کس طرح انتشار کی زد میں آ گئے۔ اس انتشار نے مسلمانوں کے اندر یقین اور اعتماد کی قوتوں کو کمزور کر دیا تو مغرب کا سامراجی دیو، اپنی ناپاک نو آبادیاتی مہم پر نکلا اور ایشیا اور افریقہ کو صدیوں تک کے لئے غلام بنا لیا گیا۔ یاد رہے کہ محکومی اور غلامی کی نوعیت صرف سیاسی نہیں ہوتی، یہ تو براہ راست ایمان و ایقان پر حملہ آور ہوتی ہے، تہذیبوں اور ثقافتوں کو بدشکل بناتی ہے، نمود و نمائش اور دجل و فریب کو سکہ رائج الوقت قرار دیتی ہے اور یوں اخلاق و کردار کو اس حد تک متغیر کر دیتی ہے کہ ہر پرانی قدر (چاہے وہ اچھی ہو) بدہیئت، اور ہر نئی قدر (چاہے وہ بری ہو) پر جمال دکھائی دینے لگتی ہے۔ برطانوی سامراج نے یہاں، اس خطہ ارض میں ہمارے ساتھ یہی سلوک کیا۔ برطانوی اور فرانسیسی اور ولندیزی اور یورپ کے دیگر استعماروں نے دوسرے ملکوں کے لوگوں کے ساتھ بھی، اور بطور خاص مسلمانوں کے ساتھ یہی غیر انسانی برتاؤ روا رکھا اور مسلمانان عالم زوال کے آخری نقطے تک اتر گئے۔ مذہب کی جگہ توہمات نے لے لی۔ اتحاد کی جگہ افتراق نے لے لی۔ امت مسلمہ کی یک جہتی کی جگہ فرقہ بندیوں اور گروہ بازیوں نے لے لی، مگر رات کی ظلمت میں ستارے بھی تو چمک اٹھتے ہیں اور حد نظر تک پھیلے ہوئے لق و دق ویرانوں میں گل لالہ بھی تو کھل اٹھتے ہیں، چنانچہ یہ اعزاز بھی اس بیسویں صدی عیسوی ہی کو حاصل ہے کہ اسی صدی میں غلامی پر رضامند لوگوں کے درمیان غلامی کی زنجیریں توڑنے والے بھی پیدا ہو گئے اور محکومی کے خلاف ایشیا اور افریقہ میں اس زور کی تحریکیں چلیں کہ قریب قریب ساری اسلامی دنیا آزادی کی نعمت سے سرفراز ہو گئی۔ یقیناً ان ممالک کی یہ آزادی سامراجی قوتوں کو سخت ناپسند تھی کیونکہ اس طرح ان کے وہ مفادات متاثر ہوتے تھے جو محکوم ممالک کے اقتصادی استحصال سے انہیں حاصل تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سیاسی گرفت کے ٹوٹتے ہی ان نو آزاد ممالک کو اپنی سیاسی گرفت سے بھی زیادہ خطرناک، اقتصادی گرفت میں دبوچنے کا منصوبہ بنایا اور آج کل ایشیائی اور افریقی ممالک میں اسی منصوبے پر عمل ہو رہا ہے، اور امریکہ کا نیا عالمی نظام اسی منصوبے کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے، مگر خود آگاہی بڑی نعمت ہے اس لئے آخر کار اس اقتصادی گرفت کو بھی ٹوٹنا ہے اور انشاء اللہ اکیسویں صدی کے آخر یا آغاز ہی میں ٹوٹنا ہے۔

سید جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال کی تمنا تھی کہ اسلامی ممالک بے شک اپنی جغرافیائی اور ثقافتی انفرادیتیں برقرار رکھیں، مگر ان سب ملکوں کو ایک لڑی میں پرونے کے لئے، اور ان بکھرے ہوئے کروڑوں مسلمانوں کو ایک ملت بنانے کے لئے مجلس اقوام کے انداز کی ایک مجلس ممالک اسلامیہ وجود میں آئے جس کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کو یک جہتی، ہم آہنگی، باہمی تعاون اور بھائی چارے کا منشور دیا جائے اور یہ منشور اول و آخر قرآن مجید کے احکام مقدسہ اور حضور رحمتہ العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی پر مشتمل ہو۔ جب تمام دنیا کے مسلمانوں کا خدا ایک ہے، رسول ایک ہے، قبلہ ایک ہے، شریعت ایک ہے، منتہائے نظر ایک ہے، تو سیاسیات اور معاشیات میں ان کا ایک رخ کیوں متعین نہ ہو۔ صرف اس صورت میں مسلمانوں کا مستقبل بھی محفوظ رہ سکتا ہے اور کرۂ ارض پر پھیلتی ہوئی احیائے اسلام کی تحریک بھی کسی مثبت نتیجے تک پہنچ سکتی ہے، اور بڑی عالمی طاقتوں کی روندی ہوئی اس دنیا میں امن، سلامتی، خوشحالی، عدل، مساوات، محبت اور اخوت کی ابدی فضا بھی قائم ہو سکتی ہے۔

ہمیں اس حقیت کو تسلیم کرنے میں کسی قسم کی جھجک محسوس

بائیں سے دائیں احمد ندیم قاسمی استاد اللہ بخش (مرحوم) احسان دانش (مرحوم)

نہیں کرنی چاہیے کہ بیسویں صدی عیسوی کے کم و بیش نصف نے ہمیں آزاد ہوتے تو دیکھا مگر ہم اب تک اپنے مقدر اور اپنے مستقبل کے صحیح معنوں میں مالک نہیں بن پائے۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے انجام پر آزاد ممالک اسلامیہ کا منظر کچھ ایسا حوصلہ افزا نہیں ہے' مگر اس کا سبب بھی یہی ہے کہ ہم لوگ ابھی تک اپنی قدیم غلامانہ ذہنیت سے خلاصی حاصل نہیں کر سکے اور نہ صرف ملکوں ملکوں اور قوموں قوموں میں' بلکہ فرقوں فرقوں اور قبیلوں قبیلوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ملت واحدہ کی اس منزل سے ابھی بہت دور ہیں جس کی نشان دہی قرآن پاک میں بار بار ہوئی ہے۔ اگر ہم مختلف ملکوں میں رہ کر بھی ایک ہی ملت اسلامیہ کے فرد ہوتے تو چند لاکھ اسرائیلیوں کی کیا مجال تھی کہ وہ اپنے تین طرف پھیلے ہوئے اسلامی ممالک کو خاطر ہی میں نہ لائیں' اور اسلامی ممالک اس ایک دشمن سے نمٹنے کی بجائے آپس میں ہی دست و گریبان رہیں۔ اگر ہم ایک ملت ہوتے تو سوویٹ یونین کو یہ جرات کیسے ہوتی کہ وہ اپنی فوجیں یوں دھڑلے کے ساتھ افغانستان میں داخل کر دیتا' جیسے امریکہ نے ویت نام میں اور گزشتہ سال عراق میں داخل کی تھیں۔ یا ایران اور عراق اپنے مسائل حل کرنے کی بجائے ایک دوسرے پر کیوں پل پڑتے' یا بھارت' پاکستان کا ایک بازو یوں آسانی سے کیسے کاٹ کر الگ کر لیتا اور دوسرے اسلامی ممالک چپ چاپ کیوں دیکھتے رہ جاتے' یا کشمیر کا مسئلہ خود ممالک اسلامیہ کے سامنے سرد خانے میں کیوں منتقل ہو جاتا۔

مگر اس طرح کی صورت حال کا یہ مطلب یقیناً نہیں ہے کہ ہم مستقبل سے مایوس ہو جائیں اور منزل تک کی طویل مسافت کو طے کرنے کی بجائے پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں۔ اکیسویں صدی کی آمد آمد ہمیں خبردار کر رہی ہے کہ وقت گزرا جا رہا ہے اور وہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اگر ہمیں ایک شان اور ایک وقار سے زندہ رہنا ہے تو ہم صرف باہمی اخوت اور تعاون ہی کی قوت سے زندہ رہ سکتے ہیں' چنانچہ ہم میں سے ہر فرد کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ اپنے حلقہ اعزہ اور دائرہ تعارف میں' ممالک اسلامیہ کے درمیان اس اخوت کی شدید ضرورت اور زبردست اہمیت کو اپنے قول و فعل سے واضح کرتا رہے اور یوں ملت واحدہ کی منزل کو ہر سانس کے ساتھ قریب تر لاتا رہے۔ اکیسویں صدی عیسوی میں اگر مسلمانان عالم کو ایک آن اور انا کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو پھر اسلامی نشاۃ الثانیہ کے منشور کی یہی سب سے پہلی اور سب سے ضروری شق ہے۔

فکاہی کالم

(۹)

احمد ندیم قاسمی

کراچی کے ایک روز نامے میں ایک مراسلہ نظر سے گزرا ہے جس میں شکایت کی گئی ہے کہ ان دنوں وہاں ایک اسکول کی سفیدی ہو رہی ہے مگر سفیدی کے اخراجات طلباء سے وصول کئے جا رہے ہیں۔ کسی سے تین روپے، کسی سے دو روپے اور کسی سے ایک روپیہ۔ مراسلہ نگار نے کہا ہے کہ یہ اسکول صوبائی حکومت کے زیر انتظام چل رہا ہے چنانچہ سفیدی اور مرمت کے اخراجات بھی حکومت ہی کو برداشت کرنے چاہئیں اور بچوں کے اس قصور کو معاف کر دینا چاہیے کہ وہ اس اسکول میں داخلہ لے بیٹھے ہیں۔

ظاہر ہے، بچوں سے وصول کی جانے والی اس رقم کا نام "سفیدی فنڈ" یا "سفیدی وغیرہ فنڈ" رکھا گیا ہوگا لیکن فنڈ ایک ایسا لفظ ہے جس میں ایک روپیہ سے ایک کروڑ روپے تک کی رقم سما جاتی ہے۔ اسی طرح "وغیرہ" بھی بہت بلیغ لفظ ہے۔ اگر کل پانچ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں تو پانچ سو روپے سفیدی پر اور باقی ساڑھے چار ہزار "وغیرہ" پر اٹھ گئے ہوں گے۔ آپ پوچھیں گے کہ یہ "وغیرہ" کیا ہوتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ "وغیرہ" ------ وغیرہ وغیرہ ہوتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔

مراسلے سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سفیدی فنڈ کی وصولی کے سلسلے سے بچوں کے ساتھ امتیاز کیوں برتا جا رہا ہے اور کسی سے تین، کسی سے دو اور کسی سے ایک روپیہ کیوں وصول کیا جا رہا ہے۔ ہمارے اندازے کے مطابق یہ اپنی اپنی توفیق کا معاملہ ہے۔ ایک گداگر بھی جب کسی مجمع سے مخاطب ہوتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ حسب توفیق اس مسکین کی مدد کرتے جاؤ۔ مقصد یہ کہ اگر کسی کی جیب میں چونی ہے تو وہ بھی بچ کر نہ جانے پائے کیونکہ "توفیق" بھی "فنڈ" اور "وغیرہ" کی طرح بہت بلیغ لفظ ہے۔

ویسے ہمیں متذکرہ اسکول میں سفیدی فنڈ کی وصولی پر کوئی تعجب نہیں ہوا کیونکہ ہم تو "گھڑا فنڈ" کا قصہ بھی سن چکے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں ایک گرلز اسکول میں ایک بچی گھڑے میں سے پانی لے رہی تھی کہ گھڑا لڑھک کر ٹوٹ گیا۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ تک رپورٹ پہنچی تو انہوں نے اسکول پر "گھڑا جرمانہ" کر دیا اور اسے "گھڑا فنڈ" کا نام دیا۔ ارشاد ہوا کہ کل ہر طالبہ ایک گھڑے کی قیمت لے کر آئے اور گھڑا فنڈ میں جمع کرائے۔ چنانچہ ایک گھڑا ٹوٹنے کی برکت سے سات سو گھڑے خریدنے کا سامان ہو گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس فنڈ سے گھڑا ایک ہی خریدا گیا۔

ایک اور اسکول کا ذکر ہے کہ وہاں کے طلباء پر "حوض فنڈ" لگا دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اسکول میں ایک حوض تعمیر کیا جائے جس میں پانی کا بہت بڑا ذخیرہ ہر وقت موجود رہے اور طلبہ کو پانی کے سلسلے میں کوئی دقت نہ ہو۔ یہ حوض فنڈ سالہا سال تک وصول کیا جاتا رہا۔ اس فنڈ سے حوض تو نہ بن سکا مگر ہیڈ ماسٹر صاحب اور اسکول کے دوسرے منصرم حضرات کے صاحبزادگان کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں میں ضرور داخل ہو گئے۔ حوض بنتا تو اس کی کوئی ٹونٹی لگتی مگر مزے کی بات یہ ہے کہ حوض فنڈ ہی میں ایک ٹونٹی نصب ہو گئی جس میں سے دولت بہتی تھی

اور اسکول کے منصرمین کی اولاد کی تشفی علم بجھاتی تھی۔

متذکرہ مراسلہ نگار اسکول کے سفیدی فنڈ ہی سے چکرا گئے ہیں حالانکہ بچوں سے اسکول کی صفائی فنڈ بھی وصول کیا جا سکتا ہے۔ اسپورٹس فنڈ تو اب بھی ہر جگہ وصول کیا جاتا ہے مگر ایک "پے گراؤنڈ فنڈ" بھی تو ہو سکتا ہے۔ اور پھر "سایہ دار درخت فنڈ" "گھنا سایہ دار درخت فنڈ" چھدرا سایہ دار درخت فنڈ "بیت الخلاء فنڈ" "بیت الخلاء کا متعلقہ فنڈ یعنی لوٹا فنڈ وغیرہ۔" "بلیک بورڈ فنڈ" "کھڑیا مٹی فنڈ" "بزرگان قوم کی تصاویر کا فریم فنڈ" غرض اگر اسکول فنڈ وصول کرنے پر آئیں تو ان کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔

ہمارے ملک ہی میں ایک نواب صاحب ان لوگوں سے "دریائی ہوا فنڈ" وصول فرمایا کرتے تھے جن کے مکان دریا کے کنارے تھے اور وہ دریا پر سے گزر کر آنے والی ہوا سے لذت یاب ہونے کے لئے اپنے مکان میں دریا کی طرف کھڑکی یا روشندان رکھنے کی جسارت کر بیٹھے تھے۔ چنانچہ اس فنڈ سے بچنے کے لئے اپنے مکانوں میں دریا کی طرف کوئی ایک آدھ روزن بھی نہیں رکھتے تھے۔ ایک غیر ملکی سیاح نے اس قصبے کو دیکھ کر لکھا تھا کہ یہاں کے لوگ پانی سے ڈرتے ہیں اور تازہ ہوا سے نفرت کرتے ہیں۔

متذکرہ اسکول میں اگر آج سفیدی فنڈ وصول کیا جا رہا ہے تو کل دروازوں کا چٹخنی فنڈ' کھڑکیوں کا شیشہ فنڈ' ڈیسکوں کا استعمال فنڈ' اساتذہ کا تھرمس فنڈ اور ہیڈ ماسٹر کا انتظام فنڈ بھی وصول کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے شکایت نہ کیجئے اور چپکے رہیئے۔ سفیدی فنڈ پر اعتراض کر کے آپ کیوں سوئے فتنوں کو جگا رہے ہیں۔

دیکھ' منہ سے نہ بول' دیکھتا جا!

---

(۴)

یہ دسمبر 1941ء کا واقعہ ہے۔ سعادت حسن منٹو آور کرشن چندر دہلی ریڈیو میں ملازم تھے۔ دونوں نے ایک فلمی کہانی "وضع" کی۔ اس کا نام "بنجارا" رکھا۔ فلموں کے مشہور تقسیم کار "منور جن پکچرز" کے مالک نے یہ کہانی پسند کی اور دونوں کو مکالمے لکھنے کو کہا۔ گیتوں کا ذکر آیا تو دونوں دوستوں نے میری تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور سیٹھ کی منظوری لے کر مجھے ملتان سے دہلی بلا بھیجا۔ میں ان دنوں ایک سرکاری ملازمت کے سلسلے میں ملتان میں مقیم تھا۔ میں فوراً دہلی پہنچا اور "بنجارا" کے آٹھ دس گانے فٹا فٹ لکھ ڈالے۔ فلم کے میوزک ڈائریکٹر فیروز نظامی تھے جنہوں نے یہ گیت پسند کئے۔ نظامی بھی شاید ریڈیو ہی میں ملازم تھے اور دہلی میں مقیم تھے۔

اب ہم تینوں ادیب "بنجارا" کا مکمل سکرین پلے اور مکالمے اور گانے لے کر سیٹھ کے پاس پہنچے۔ سیٹھ نے گانوں کی تکمیل کو معاوضہ ادا کرنے کی شرط قرار دے رکھا تھا۔ چنانچہ اس روز ہمیں اپنی محنت کا معاوضہ ملنا تھا۔ راستے میں منٹو نے مجھے سمجھایا کہ جب تم سیٹھ کو گیت سناؤ اور وہ تمہیں کسی لفظ پر ٹوکے تو کہہ دینا کہ بہت اچھا' آپ کی خواہش کے مطابق بدل دوں گا۔ منٹو نے کہا کہ تم شاعر لوگ بڑے "فراڈ" ہوتے ہو (فراڈ" منٹو کا ایک محبوب لفظ تھا) کسی کی ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کر سکتے مگر سیٹھ کی بات برداشت کر لینا کیونکہ دو ہزار روپے کا معاملہ ہے اور ہم اس خطیر رقم کی ادائیگی کو کھٹائی میں نہیں ڈالنا چاہتے۔

جب سیٹھ کے ہاں باریابی ہوئی تو قسم لے لیجئے کہ نہ اس وقت تک میں نے کہیں اتنا موٹا آدمی دیکھا تھا اور نہ اب تک دیکھا ہے۔ سیٹھ جوان آدمی تھا مگر اس کی جوانی پر اتنی چربی چڑھی ہوئی تھی کہ اگر چربی کے چھ من کسی طرح ہٹا دیئے جاتے تو نیچے سے ایک خوبصورت جوان برآمد ہو جاتا۔ سیٹھ ایک کرسی پر بیٹھا تھا مگر بیٹھنے میں وہ جو انسانی جسم میں خم پیدا ہوتے ہیں' وہ کہیں نمایاں نہیں تھے۔ ٹھوڑی سے لے کر گھٹنوں تک وہ ایک خط مستقیم میں بیٹھا تھا اور جب اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو یوں محسوس ہوا جیسے میں نے گرم گرم ڈبل روٹی سے مصافحہ کیا ہے۔ بے ہنگم موٹاپے پر عموماً ہنسی آتی ہے مگر اس روز سیٹھ کا وحشناک موٹاپا دیکھ کر مجھے اس پر' اس کی عمر پر اور اس کی دولت پر ترس آ رہا تھا۔

سیٹھ نے بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ گیت مکمل ہو گئے ہیں۔ حکم

ملا کہ گیت سناؤ۔ میں نے گیت سنانے شروع کیے۔ کبھی کبھی میں سیٹھ کے چہرے کو بھی دیکھ لیتا تھا کہ شاید وہاں تحسین کی کوئی کیفیت نمایاں ہو مگر کسی کیفیت کے نمایاں ہونے کی گنجائش ہی نہیں تھی کیوں کہ جذبے اور اس کے اظہار کے درمیان چربی کی فصیل حائل تھی۔ اچانک سیٹھ نے مگدر اٹھایا۔ میرا مطلب ہے اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور بولا۔ "یہ نہیں چلے گا۔ چار آنے والا لوگ" "امید کو نہیں سمجھتا۔ یہاں کچھ آشا واشا لگاؤ"! منٹو کی ہدایت کے مطابق میں نے آشا واشا لگانے کا وعدہ کرنے کے لئے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ منٹو کو تاؤ آ گیا۔ بولا۔ "سیٹھ صاحب۔ جس فن کے بارے میں علم نہ ہو اس کے بارے میں نہیں بولا کرتے۔ یہاں امید کا لفظ انگوٹھی میں سچے نگینے کی طرح سجا ہوا ہے۔ آپ یہاں آشا لگوا کر انگوٹھی میں "امیٹیشن" لگوا دیں گے۔"

کرشن چندر بھی گھبرا گیا اور میں ہکا بکا رہ گیا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ جو شخص دو ہزار روپے کے لئے مجھے سب کچھ برداشت کرنے کی تلقین کر رہا تھا' اب خود اس معاوضے پر پانی پھیرے دے رہا ہے۔ کرشن چندر نے دبی زبان سے کہا بھی کہ آشا کی تجویز بھی کچھ ایسی بری تو نہیں۔ کرشن کا مقصد منٹو کو اس کا سابقہ موقف یاد دلانا تھا مگر منٹو بولا۔ "تم خاموش رہو کرشن چندر۔ تمہاری شعری حس بھی سیٹھ صاحب کی حس سے مختلف نہیں ہے۔ اس گیت میں لفظ امید ہی چلے گا ورنہ سیٹھ صاحب ہمیں اجازت دیجئے!" سیٹھ اتنے شدید ردعمل کا عادی نہ تھا اس لئے فوراً ہتھیار ڈال دئے اور بولا۔ "اچھا بابا اچھا۔ تم تو اس طرح آنکھیں نکال کے بات کرتا ہے کہ ڈر لگتا ہے۔ چلو آشا کو گولی مارو۔ آگے چلو!" ------ پھر وہ ہنسا اور میں اس کی ہنسی کا سلسلۂ عمل کبھی نہیں جان سکتا کہ یہ ہنسی پہلے اس کی ناف کے آس پاس پیٹ میں پیدا ہوئی کیونکہ اس کا پیٹ بری طرح متزلزل ہوا۔ پھر اس کے سینے میں بھونچال آیا۔ پھر اس کی ٹھوڑی کے نیچے چربی کی چار پانچ لہروں میں طوفان برپا ہوا اور تب جا کر اس کے حلق سے "ہہ ہہ ہہ" کی آواز پیدا ہوئی۔ قہقہہ "کراچی سے لاہور تک" کے اس سفر کی وجہ سے تھکن سے نڈھال ہو گیا تھا۔

آخر ہم نے مسودہ سیٹھ کے حوالے کیا اور دو ہزار کا چیک لے کر باہر آئے تو منٹو بولا۔ "اس چیک کو فوراً کیش ہونا چاہیے۔ میں نے بمبئی میں ان سیٹھ لوگوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ شام سے پہلے پہلے سیٹھ اپنا ارادہ بدل لے اور چیک کینسل کرا دے۔ اور پھر آج کل تو عالمی جنگ بھی ہو رہی ہے۔" کرشن اور میں نے کہا بھی کہ

احمد ندیم قاسمی اردو مرکز لندن میں گوشہ خدیجہ مستور کے قریب۔

کل صبح سویرے کیش کرا لیں گے مگر منٹو نے ہم دونوں کی "دیہاتی سادہ لوحی" کا مذاق اڑایا۔ فوراً چیک کیش کرایا۔ دو ہزار کو تین پر تقسیم کر کے رقم بانٹی اور جب ہم تینوں امراء کی سی شان سے واپس منٹو کے گھر پہنچے تو سیٹھ کا آدمی ہمارے انتظار میں تھا۔ سیٹھ نے کہلا بھیجا تھا کہ جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا ہے اور اب وہ سیدھا برصغیر کا رخ کرے گا اس لئے ہم نے فلم بنانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ اپنا مسودہ واپس لے جاؤ اور ہمارا چیک ہمیں دے جاؤ۔ منٹو نے فاتحانہ انداز میں ہم دونوں کو دیکھا اور پھر سیٹھ کے آدمی سے کہا۔ "سیٹھ سے کہو' مسودے کو آگ لگا دے کیونکہ ہم نے اس کا چیک کیش کرا کے اس کے روپے کو آگ لگا دی ہے"!

محترمہ پروین فنا سید کا تیسرا مجموعہ کلام

"یقین" آجکل طباعت کے مراحل میں ہے

کامیاب زندگی کا تصور

احمد ندیم قاسمی

کامیاب زندگی کا کوئی نپا تلا معیار مقرر کرنا بظاہر مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس سلسلے میں ہم ایک مصلح اور ایک فن کار' ایک مالک اور ایک مزدور' ایک زمیندار اور ایک کسان' ایک تاجر اور ایک گاہک' ایک وزیر اور ایک فقیر کے نظریات کو ایک دوسرے پر منطبق کرنے بیٹھیں گے تو سوائے اس کے کوئی بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا کہ وہ منطبق نہیں ہو سکتے۔ ایک معاشرے میں ایک شخص نے کامیاب زندگی کا جو پیمانہ گھڑ رکھا ہے' اسی معاشرے میں وہی پیمانہ ایک اور شخص کے نزدیک ناکام ترین زندگی کا پیمانہ ہو سکتا ہے۔ ایک ڈاکو کی کامیاب زندگی کا معیار اس کی ڈاکہ زنی کا معیار ہے' مگر ایک ولی اللہ کی کامیاب زندگی کا معیار یہ ہے کہ اس کے افعال کس حد تک رضائے الٰہی کے تابع ہیں۔ انسانی مزاج کا یہ تنوع اس کا حسن بھی ہے اور اس کی الجھن بھی۔ حسن اس کے تضاد میں ہے اور الجھن اس کے تضاد کے دونوں سروں کے درمیانی تفاوت کی۔

مگر زندگی کی سطح پر مچلتی ہوئی ان لہروں میں غوطہ مار کر دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ سطح کی کروڑوں لہریں ایک ہی سمندر کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ یہ سب ایک ہی موضوع کی تفصیلیں ہیں۔ ایک تنے پر اگی ہوئی شاخیں ہیں۔ جن میں سے ایک کا رخ مشرق کو ہے تو دوسری کا مغرب کو۔ ایک پر پتوں کی افراط ہے تو ایک پر پھولوں کی۔ اس کے باوجود تنے پر ضرب لگایئے تو درخت کی آخری پھننگ تک لرز اٹھے گی۔

کامیاب زندگی کے بارے میں میرا نظریہ انسانی وحدت کے احساس و شعور سے بندھا ہوا ہے۔ یہ وحدت میرے ذہن میں انسانی تسلسل کے نظریے کو جنم دیتی ہے اور انسانی تسلسل پر اعتماد و یقین زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے بضاعتی کے ان تصورات پر زبردست چوٹ ہے جو انسان کی ساری عمر رونے دھونے اور ڈرنے مرنے میں مصروف رکھتے ہیں۔ ٹھیک ہے' آپ اور میں بحیثیت انسان فانی ہیں' لیکن کیا انسانیت بھی فانی ہے؟ اگر شجر حیات پر سے دو' دس' بیس شاخیں ٹوٹ کر گر جائیں گی تو کیا نئی شاخیں ان کی جگہ کبھی نہیں لیں گی؟ کیا جب ایک لہر ساحل کی ریت میں جذب ہو جاتی ہے تو سارا سمندر مر جاتا ہے؟

میں جب سوچتا ہوں کہ ازل سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر ابد تک کرہ ارض پر' صرف ایک انسان آباد رہا ہے اور میں اس کل کا ایک جز ہوں' ہم سب اس کل کے جز ہیں اور وہ ایک انسان ہم سب کے لئے ذہنوں میں رچا بسا ہوا ہے' تو اس صورت میں میرے لئے دنیا کا کوئی انسان اجنبی نہیں رہتا۔ کوئی جغرافیائی سرحد میرے پھیلے ہوئے بازوؤں کو نہیں روک سکتی۔ اور عقیدے کا اختلاف' یا جلد کی رنگت' یا سوچنے کا انداز' یا لباس کا فرق یا زبان کا تفاوت' غرض کوئی چیز میرے پیار کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ یہی احساس مجھے انسان کا احترام کرنا سکھاتا ہے' یہی مجھے حسن و خیر کی تلاش پر اکساتا ہے۔ اسی کی قوت سے میں "عباد الرحمٰن الذین یمشون فی الارض ہونا و اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما" پر عمل پیرا رہ سکتا ہوں اور یہی احساس مجھے پاکستان و فلسطین کے مہاجروں' جنوبی افریقہ اور امریکہ کے حبشیوں' جرمنی اور روس کے یتیم بچوں اور جاپان کی کنواری ماؤں کے دکھوں پر رلاتا ہے۔ اگر انسان اپنے ہی خول میں بند ہو کر رہ جائے تو اسے آپ ہی اپنا خدا اور آپ ہی اپنا رسول بننے پر مجبور ہو جانا ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ پاگل پن کے آثار ہیں۔

رہا مختلف انسانوں کے کرداروں میں مزاجوں کا یہ تفاوت' تو یہ پھولوں کی بوقلمونی کی حد تک تو ایک بے پناہ حسن ہے اور ہر صورت میں قائم رکھنے کے لائق ہے' لیکن اگر یہ تفاوت اپنے استحصال کے لئے دوسروں کا لباس نوچ لیتا ہے' اپنی عظمت کا سکہ بٹھانے کے لئے دوسرے کے سینے میں خنجر اتار دیتا ہے تو میرا عقیدہ ہے کہ اس قسم کے مزاجوں کا انسانی جبلت سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ معاشی ناہمواریوں' سماجی

روایات' معاشرتی ماحول اور گھریلو تربیت کے کرشمے ہیں' اور ان کی اصلاح ممکن ہے۔ صدیوں کے بعد سہی' لیکن ایک منصفانہ معاشرہ انسانی مزاجوں کے ان "مبالغوں" کو آخر کار ختم کر سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اگر دنیا اپنی خود کشی کے آلات سے تباہ ہونے سے بچ نکلی (اور وہ بچ نکلے گی) تو ایسا معاشرہ ضرور قائم ہوگا۔

اگر ہم ایک آدمی کو صالح اور ایک لاکھ آدمیوں کو غیر صالح کہہ دیتے ہیں تو ہمیں کیا معلوم کہ صالح نے اپنے کتنے نقائص کو اپنے مصفا ملبوس اور مقطع صورت کے پیچھے چھپا رکھا ہے' اور ایک غیر صالح کی نیم عریانی کے پیچھے کتنی پیاری پیاری نیکیاں جمع ہیں۔ سو اس قسم کی طبقہ بندیاں محض ڈھکوسلے ہیں۔ اصل چیز شخصیت کا نکھار ہے جو دوسری شخصیت کے نکھار کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ نکھار کہ ہم فروعات میں الجھے رہ جاتے ہیں اور یہ دیکھنے کی تکلیف نہیں کرتے کہ حسن و خیر کے جذبات کی بنیاد سارے عالم انسانیت میں یکساں ہے۔

نیکی' قوانین و روایات کی خادم نہیں اور حسن' رنگ اور نقوش کا غلام نہیں۔ نیکی کو وضو کے طریقے یا مردے کی تدفین کے کسی خاص ڈھب میں محدود نہیں کیا جا سکتا' اور حسن کو حبشی عورت کے موٹے ہونٹوں اور گورے مرد کی بھوری آنکھوں میں قید کرنا حماقت ہے۔ ڈھونڈنے کی چیز انسانی ذہن کا وہ مرکز ہے جہاں سے ابھرتا ہوا جذبہ موٹے ہونٹوں اور بھوری آنکھوں کو بھی حسین بنا دیتا ہے' اور نماز کے دوران میں رونے والے کو پوجا کے دوران میں گانے والا اجنبی معلوم نہیں ہوتا۔ آج نہ سہی' کل سہی لیکن جس دن انسانوں کو معلوم ہوگا کہ

تین دوست بائیں سے دائیں اختر حسین جعفری (مرحوم) احمد ندیم قاسمی سید محمد کاظم۔

بعض ایسے اصولوں پر مبنی ہونا چاہیئے جس پر کسی ملک' کسی مذہب' کسی قوم' کسی فلسفے اور کسی معاشرے کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اگر ہماری سوچیں تعصب و تنگ نظری کی گرفت میں نہ ہوں تو نیکی اور حسن کا یہ عالمگیر معیار' باآسانی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ اختلاف فضیلوں اور جزوں کا ہے اور ہمارا المیہ یہی ہے کہ ہم ان ہی میں الجھے رہ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی خواتین غیر محرموں سے ہاتھ ملانا تو کجا' ان کے سامنے آنا بھی پسند نہیں کرتیں۔ مغرب میں ایسا نہیں ہے' مگر کیا ہم میں اتنا حوصلہ ہے کہ ہم مغرب کے سارے طبقہ اناث کو آبرو باختہ کہہ ڈالیں؟ مشکل یہی ہے

ارے! ہم نیکی اور حسن کے معاملات میں کتنے یکساں ہیں! تو وہ کتنا عظیم دن ہوگا۔ اس دن کامیاب زندگی کے بارے میں سارے عالم انسانیت کا مشترکہ نظریہ عالم وجود میں آئے گا۔ میں اگر آج ہی اس نظریے میں حصہ دار بن رہا ہوں تو مجھے بحیثیت انسان اس کی اجازت ہونی چاہیئے۔

لاہور

3 جولائی 1958ء

(یہ مضمون محترمی انور دل صاحب کی مرتبہ انتخالوجی "کامیاب زندگی کا تصور" میں شامل تھا)

حرفِ تحسین

جوش ملیح آبادی

سچ بولنا ہمیشہ خطرناک رہا ہے لیکن میں ہزاروں بار مجروح ہونے کے بعد بھی' سچ بولنے کی "خوئے بد" سے باز نہیں آتا' اور اسی بنا پر لکھ رہا ہوں کہ اس دور کے جس قدر بھی شاعر ہیں' احمد ندیم قاسمی کو ان سب سے براعل بہتر سمجھتا ہوں۔ ندیم صاحب اچھے شاعر ہی نہیں' اچھے انسان بھی ہیں اور چونکہ اچھا انسان ہر دور میں نایاب رہا ہے اس لئے میں ندیم کی دل سے قدر کرتا ہوں اور مجھے ان سے محبت بھی ہے۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری

ایک مدت سے احمد ندیم قاسمی صاحب کا شعور اور حسن کارانہ تخلیقات نظم و نثر میرے مطالعے میں ہیں۔ مجھے تو اس حلقے میں ایک بھی ایسا نظر نہیں آیا جسے کسی جہت سے بھی احمد ندیم قاسمی کا مماثل کہہ سکوں ------ "افکار" (رسالہ "افکار" کراچی کے ندیم نمبر کے حوالے سے) چاہے تو میں احمد ندیم قاسمی پر اپنی تحریر کو مکمل کرنے کے بعد کتابی صورت میں شائع کرنے کے لئے حاضر کر دوں گا ------ آپ کا صحیفہ "افکار" چار پان سو صفحے میری رائے کے لئے وقف کر ہی نہیں سکتا۔ میں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو ڈیڑھ سو صفحے لکھ دینے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تو ابھی اس شخصیت کے بارے میں اظہار رائے کی تمہید ہی ہے۔

فراق گورکھپوری

ان کا کلام ایک حساس دل و دماغ کی پیداوار ہے جس نے ان کے لہجے میں ایک چٹیلا پن' اور ان کے انداز فکر میں ایک خلوص اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔ ان کی شاعری میں تقلید' فرسودگی' باسی پن' روایت زدگی اور پیش پا افتادہ باتیں نہیں ہوتیں' ان کے بجائے ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے جو محض جدت سے پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ ایک انفرادی وجدان سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ ان کی شاعری کی ایک شخصیت ہے جس کے مخصوص خد و خال ہیں۔ اس شاعری کی ایک سیرت ہے اور ایک پہچان لیا جانے والا کردار ہے۔ اس شاعری کی شرافت نفس اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتی ہے۔ ان کی شاعری کو ہم پیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور دل سے اس کی عزت کرتے ہیں ..... اس شاعری کی رگیں بہت حساس ہیں۔ اس کی ادائیں بیک وقت سادہ و پرکار ہیں۔ ہم اس شاعری کو ایک قیمتی انسانی دستاویز ماننے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس شاعری نے اردو ادب کو توانائی اور توانگری بخشی ہے۔

ندیم کے اشعار میں زندگی اور مسائل زندگی کی بھرپور چوٹیں ہیں۔ ان کی آواز میں زندگی کے خواب' زندگی کے درد' زندگی کی فتوحات اور ان فتوحات سے بھی بڑھ کر اہم چیز' زندگی کی کشمکش' گہرے اور پر خلوص سوچ کے عناصر' سب مل کر حل ہو گئے ہیں' اور ان کے نغمے فضائے زندگی میں وہ گونج پیدا کر رہے ہیں' وہ جھنکاریں اٹھا رہے ہیں' اس کھنک کو جنم دے رہے ہیں جو شاعر اور شاعری کو لازوال بنا دیتی ہیں اور جو ہمیں زندگی کی گہرائیوں اور بلندیوں کی سیر کراتی ہیں اور بہت دور تک سیر کراتی ہیں اور ہماری زندگی کو ناقابل فراموش تجربات سے اور انمول احساسات سے مالا مال کر دیتی ہیں۔

پنجاب کی سرزمین سے ہی ایسا شاعر اٹھ سکتا تھا جس کی شخصیت میں نرمی اور کس بل کا حسین ترین سنگم نظر آئے اور توانائی اور نزاکت جس کی شاعری کی جان ہو۔ ندیم کے اشعار کے پیچھے لمبے اور گہرے سوچ کا بہت بڑا پس منظر ہوتا ہے یہی سوچ ان کے کلام میں وہ چوٹیلا پن اور وہ کاٹ پیدا کر دیتا ہے جو صحت مند شاعری کی خصوصیت ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

انہوں نے ادب کی خدمت کو وظیفہ حیات بنا رکھا ہے اور یار و اغیار کی تحسین و نفرین سے بے نیاز اور حکومتوں اور اداروں کی سرپرستی سے مستغنی اپنے راستے پر مستقل مزاجی سے گامزن ہیں کیونکہ ان کے فن و کردار میں تضاد نہیں۔ اسی لئے ان کی تحریروں میں اثر اور خلوص کی تابانی ہے۔ یہ ان کے ریاض کا کرشمہ ہے کہ عمر کے ساتھ ان کے قلم کی رفتار زیادہ تیز ہوتی جاتی ہے ..... ہر موضوع اور ہر موڑ پر انہوں نے اپنے فن کو ان قدروں کا ترجمان بنایا ہے جن کی بقا پر انسانیت کے حال و مستقبل کا انحصار ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ انہوں نے کبھی مصلحت سے کام نہیں لیا اور حرف حق کے اظہار سے گریز نہیں کیا۔ تذبذب کے اس دور میں ان سے بہتر حق گو اور حق شناس سخن ور مشکل سے ملے گا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

1935ء کے بعد کی شاعری میں نظم کو آگے بڑھانے اور غزل کو نئے زمانے کی روح سے آشنا کرنے کا کام کئی شاعروں نے کیا ہے مگر ندیم کی آواز اور ندیم کا فن منفرد ہے۔ وہ اچھا شاعر بھی ہے اور اچھا انسان بھی۔ اور جو لوگ ان دونوں باتوں کی حقیقت جانتے ہیں وہ تصدیق کریں گے کہ میری نظر میں اس کا رتبہ کیا 1935ء کے بعد جن دو تین شاعروں کی شاعری میں کوئی کھوئی ہوئی شے ملتی ہے ان میں ندیم بھی ہے۔ اس کی شاعری میں فکر کی شوکت بھی ہے مگر مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ فکر کی گھن گرج کے اندر یا اس کے سائے میں چاندنی بکھیرتا رہتا ہے۔ چاندنی کی یہ کیفیت کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔

سید وقار عظیم

قسام ازل نے جس ندیم کو حسن کے تقدس اور پاکیزگی کی گہرائیوں میں ڈوب جانے والی چشم بینا کی دولت عطا کی ہے اسی نے اس کے سینے کو' ایک دل درد مند کا مسکن بھی بنایا ہے اور یوں اس کے افسانے اب بھی بیک وقت مقدس روحانیت اور تلخ حقیقت کے افسانے ہیں۔ ندیم نہیں بدلا اس لئے اس کی کہانیاں بھی نہیں بدلیں ------ یہ دعویٰ بھی آپ کو میرے بہت سے دعووں کی طرح مجنونانہ معلوم ہوگا کہ ندیم نہیں بدلا لیکن میں اپنے اس جنون کا ڈھنڈورا پیٹ کر کہتا ہوں کہ ندیم نہیں بدلا۔ اس لئے کہ وہ بدل ہی نہیں سکتا۔ اس کا دل بدل جانا قانون قدرت اور منشائے الٰہی کی نفی ہے۔ منشائے الٰہی نے اسے دو روپ دے کر پیدا کیا تھا' آنکھوں والا روپ اور دل والا روپ------ اس کے وہ دونوں روپ اب بھی اپنے افسانوں میں اسی طرح اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں جیسے 1952ء میں' لیکن قدرت کا ایک قانون اور بھی ہے کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی دنیا انسان کے روپ کو غیر محسوس طریقے پر بہت آہستہ آہستہ بدلتی بھی رہتی ہے کہ اس کی اساس تو جوں کی توں رہے لیکن اس کے رنگ میں نکھار اور روپ میں ابھار بھی آتا جائے اور یہی نکھار اور ابھار ہے کہ جس سے انسان کے سوچنے اور اس سوچ کو ظاہر کرنے کا طریقہ بدل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں جن کا اس وقت ذکر ہے' احساس کی شدت زیادہ گہری ہے۔ اور بیان کا جوش زیادہ نمایاں ہے۔ شعریت مبالغہ بن گئی ہے اور طنز جو سوز و گداز کا ایک پردہ ہے' زیادہ تیکھی دکھائی دیتی ہے لیکن اس مبالغہ نما شعریت میں بلا کی اثر انگیزی ہے کیونکہ دونوں کا سرچشمہ فن کار کی آنکھوں کی سچائی اور دل کا خلوص ہے۔ "بازار حیات"' "گھر سے گھر تک" اور "برگ حنا" کے افسانے پڑھ کر کوئی ندیم کو اس عہد کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانے یا نہ مانے لیکن اس سے یہ ہٹ دھرمی ہرگز نہیں ہو سکتی کہ وہ اس کے عظیم انسان ہونے سے انکار کرے اور اس کے عظیم افسانہ نگار ہونے والی بات کو اختلافی مسئلہ سمجھ کر خاموش ہو جائے۔

ڈاکٹر اختر اورینوی

احمد ندیم قاسمی اردو کے ایک جلیل و جمیل فن کار ہیں اور یہ ہماری نسل کی ادبی کہکشاں کے ایک بہت ہی تاباں ستارہ ہیں۔ افق پر اگر صرف ایک ستارہ چمک رہا ہو تو اس کی روشنی آنکھوں میں کھبتی ہی ہے لیکن اگر کوئی تارہ ستاروں کے جھرمٹ میں بھی بہت ہی درخشاں نظر آئے تو اہل نظر اس کو دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں۔ ندیم ایک اختر درخشاں ہیں۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

ان کا مشاہدہ گہرا اور بے جھجک اور انسانی فطرت کے پیچ و خم سے ان کی واقفیت بڑی دور رس اور بلیغ ہے۔ وہ زندگی کی سفاک حقیقتوں پر کوئی رنگین پردہ نہیں ڈالتے۔ اور انسانوں کے عصری محرکات کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کرنے سے نہیں جھجکتے۔ جنس سے ان کی دلچسپی معمول کے مطابق ہے۔ اس میں مریضانہ لذت اندوزی نہیں ان کے یہاں طنز کے چھینٹے بھی جگہ جگہ ملتے ہیں۔ مگر یہ طنز ایسا نہیں جو مروم آزاری کی سرحدوں کو چھو لے۔ ان کے نقطۂ نظر میں اعتدال اور سلامت روی اور ان کے لہجہ میں نرمی' شائستگی اور حلاوت ملتی ہے جو برسوں کے عمل صیقل اور کام و دھن کی ہر آزمائش سے گزرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ وہ مادے کی طہارت کے بھی قائل ہیں اور روح کو اس طہارت کی ایک ترقی یافتہ شکل بھی سمجھتے ہیں۔ کسی بھی ادبی فنکار کے لئے وجہ امتیاز یہ نہیں ہے کہ اس کے یہاں سیاست' مذہب' فلسفہ موجود ہے یا نہیں' بلکہ یہ کہ وہ ان کی موجودگی یا غیر موجودگی سے قطع نظر انسانی ادراک کی کس حد تک توسیع کرتا ہے اور اس کے نقطۂ نظر میں کتنی انفرادیت' ہمہ گیری' توازن اور مرکزیت ہے۔ پیش پا افتادہ حقیقتوں کے ایسے گوشوں کو جنہیں دیکھتے اور محسوس سب کرتے ہیں' گویائی عطا کرنا بڑے ظرف اور حوصلے کا کام ہے۔ عام آدمی کے لئے ہر چھوٹے بڑے تجربے کے ارد گرد ایک خول سا چڑھا ہوتا ہے۔ یہ خول ہمارے وہموں' تعصبات اور آدرشوں کا ہوتا ہے۔ اور ہم رسم و رواج' ذہن کاری اور بے رخی کی وجہ سے اس خول کو توڑنے پر رضا مند نہیں ہوتے۔ افسانہ نگار' اشیاء' تجربات اور کرداروں کو ہمارے سامنے برہنہ

پیش کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ اسی میں اس کی جیت ہے۔ ندیم قاسمی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں ایک اعلیٰ فنکار کی جرأت اور صداقت کے ساتھ تہذیب اور دل سوزی' متانت اور میانہ روی اور ہمدردی اور رفاقت کا جذبہ ہر ہر قدم پر ہمارا ساتھ دیتا ہے۔ وہ انسانوں کے سامنے ایک آئینہ بھی رکھ دیتے ہیں جس میں ان کی خوبیاں اور خامیاں بلا کم و کاست جھلک اٹھیں اور ایک معیار بھی' جہاں تک انہیں پہنچنا ہے۔

احسان دانش

سچے اور حقیقی ادیب یا شاعر کو کبھی اس کے دور نے سہولتیں نہیں دیں۔ ندیم بھی اسی صف کے انسان تھے۔ ان پر بھی معاشی گرفتیں اور اقتصادی تنگیاں آئیں مگر انہوں نے اپنا انداز نہ بدلا کیونکہ وہ ادب کی تقدیس سے آشنا تھے اور شعر کی عظمت و برکت سے آگاہ تھے۔ ندیم زندگی اور اس کے حقائق کو سطحی نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ آثار و قرائن کے رخ پر آگے کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ جدید دور کے شاعر ضرور ہیں لیکن قدیم محرکات سے بھی بخوبی آشنا ہیں اور دونوں کے درمیان رہ کر وہ اپنے ادب کی بلندی پر اسی طرح معلوم ہوتے ہیں جیسے دور سے اٹھنے والی آندھی کو دیکھ رہے ہوں۔ وہ جو کچھ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں' اسے اپنے انداز بیان سے سجا کر اس میں ایسی افسونی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جس سے دکھی دل' بیدار دماغ اور بیتاب روحیں ایک کیف میں گم ہوتی معلوم ہونے لگتی ہیں ..... ان کے سینے میں ایک فن کار کا نہیں بلکہ خالق کا دل دھڑکتا محسوس ہوتا ہے جو انسان کی محبت میں بے تاب ہے۔

شاہد احمد دہلوی

قاسمی صاحب چوٹی کے فنکار ہیں۔ انہوں نے ہر صنف ادب میں طبع آزمائی کی ہے اور نہ صرف طبع آزمائی کی ہے بلکہ قدر اول کی تخلیقات پیش کی ہیں ..... قاسمی صاحب یقیناً "جی نی اس" (GENIOS) ہیں کہ بے انتہا زحمتیں گوارا کر لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہیں جو کام بھی سونپا گیا' اس میں محنت و استقامت سے انہوں نے چار چاند لگا دیئے۔ یہ سلیقہ خدا کی دین ہے۔ مگر ہم بڑے ناشکرے لوگ ہیں۔ سچا اعتراف نیکی کو ابھارتا ہے۔ اعتراف تو کجا' ہم کسی جوہر قابل کی چمک کو بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ شاید ہم بہت ہی چھوٹے دل کے لوگ ہیں ..... مخالفت کی آگ میں تپ کر قاسمی صاحب کندن بن گئے ..... ناسازگار حالات اور مخالفتوں نے انہیں سخت کوش بنا دیا اور اس سخت کوشی نے انہیں منتہائے عروج پر پہنچا دیا۔

وقار انبالوی

بھلا جس شخص کو مرغی کے انڈے کی جگہ بطخ کا انڈہ کھلا دیا جائے اور وہ انڈہ کھا کر چلے کے جاڑوں میں اس کا جی تیرنے کو چاہنے لگے' اس شخص کے طنز و مزاح کا احاطہ کیسے ممکن ہے؟ کچھ امکان ہو بھی تو قاسمی پر بات کرنے کے لئے تو عمر اور دفتر چاہیئے۔ مختصراً یوں کہہ سکتا ہوں کہ قاسمی کی مزاحیہ طبیعت نے جس تیزی سے رہوار قلم کو سرپٹ دوڑایا ہے اس سے اس کے معاصرین کا یہ حال ہے جیسے کچی راہوں میں پیدل چلنے والوں کے لئے:

اڑتی ہوئی گرد چھوڑے جاتے ہیں سوار

اور قاسمی اپنے معاصرین سے بمراحل اس طرح آگے نکل گیا ہے کہ اس کے معاصر اقرار کریں یا نہ کریں' جب وہ اپنے چہرے سے پسماندگی کی گرد پونچھتے ہیں تو زبان حال سے گویا اپنی جگہ یہ بھی کہتے ہیں

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

پروفیسر حمید احمد خاں

احمد ندیم قاسمی ان ہم عصر ادیبوں میں ہیں جن سے مستقبل میں ضرور انصاف ہوگا ..... وہ ایک ترقی پسند ادیب ضرور ہیں لیکن ان کی ترقی پسندی پاکستانی روایت کی ہمنوا ہے۔ یہ ایک کارنامہ ہے جس کے لئے پاکستانی ادب کی تاریخ قاسمی صاحب کو شکریے سے یاد رکھے گی۔

سید عابد علی عابد

میں نے ان کو ہر مرحلے سے گزرتے دیکھا ہے۔ شوریدہ سر' جھنجلایا ہوا فنکار ایک اعتدال اور رکھ رکھاؤ کے دائرے میں بہت دوزخوں سے گزر کر داخل ہوا ہے۔ ان دوزخوں کی آگ نے ان کی شخصیت اور ان کے فن کو کندن کی طرح کھرا کر دیا ہے ..... وہ کن اصناف میں جاوداں رہیں گے' انسان ایک شعر سے غیر فانی ہو جاتا ہے' انہوں نے تو مجموعے قلم بند کئے ہیں جن میں ابدیت کی جھلک گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف ہم لوگ رسماً کر رہے ہیں۔ زمانہ اپنا فیصلہ صادر کر چکا ہے۔ وہ اس کے محتاج نہ تھے۔

الطاف گوہر

تیسری دنیا کے صف اول کے شعرا میں قاسمی کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے' اس کے دل میں انسان دوستی کی شمع فروزاں ہے۔ کیا وہ

ایک عظیم شاعر ہے؟

قاسمی ایک بڑا ہی حساس' بڑا ہی صاحب دل' اور صاحب درد شاعر ہے جس کا ہر شعر مضراب کی طرح ہے جس کی زد میں آکر سننے والے کی شخصیت کے تار جھنجھنا نے لگتے ہیں۔

کیا قاسمی ایک عظیم مفکر ہے؟

نصف صدی سے ایک ظالمانہ اور نامنصفانہ معاشرہ قاسمی کا ہدف ہے اور اس کی فکر معاشرے کے خداوندوں کو چین نہیں لینے دیتی۔

قاسمی میرے نزدیک ایک نہایت ہی شریف النفس' بے تعصب' بے ریا' پر خلوص اور سچ بولنے والا انسان ہے جس کے عزم اور ارادہ میں تمام عمر جھول نہیں آئی' قلم اس کا ایمان ہے اور ہر حال میں اس نے اس کی عصمت کی پاسداری کی ہے شاید یہی عظمت فکر و فن ہے۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

قاسمی صاحب کے ٹھہراؤ اور توازن اور نرمی میں طوفان چھپا نظر آتا ہے۔ وہ ان لوگوں میں ضرور ہیں جن کے بحر کی موجوں میں کمال اضطراب ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس کو اپنے قابو میں رکھ کر ایک مخصوص رخ کی طرف چلا کر' مفید عام بنانے کا بھی شعور ہے۔ ہمارے یہاں محض طبعزاد لکھنے والوں کی کمی نہیں مگر ہمارے ادب یا کسی ادب کی ترقی کے لئے قاسمی صاحب کے سے ادیبوں کا ہونا ضروری ہے' اس لئے میں انہیں ماڈل ادیب مانتا ہوں ..... اکثر ایسا ہوا کہ میری لکھی ہوئی چیزوں پر انہوں نے نہایت خلوص کے ساتھ کچھ ترمیم کرنے کی اجازت طلب کی۔ مجھے ان کے شعور اور خلوص پر اتنا اعتماد ہے کہ انہیں ہر قسم کی تبدیلی کر دینے کی پوری اجازت دے دی' اور میں نے یہ دیکھا کہ ان کی رد و بدل نے میری تصنیف کی قیمت میں ضرور اضافہ کر دیا ..... مدیر کی حیثیت سے ادب کے وہ بہت ہی مناسب ڈائریکٹر یا مصلح ہیں اور اس کام کو وہ جس انسانیت سے انجام دے رہے ہیں' وہ انہی کا حق ہے؟

ن ۔ م ۔ راشد

("افکار" کے ندیم نمبر میں کلام ندیم کے" انتخاب کو میں کئی مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ اور ہر بار قاسمی صاحب کی قدر و منزلت میرے دل میں بڑھتی چلی گئی ہے۔ ایران میں بعض شیعہ حضرات کا یہ ایمان ہے کہ قرآن دراصل حضرت علیؓ پر نازل ہونے والا تھا لیکن فرشتے کی غلطی سے حضرت محمدؐ کے ہاتھ لگ گیا! چنانچہ مجھے بھی یہ انتخاب پڑھ کر یقین ہونے لگا ہے کہ یہ وحی خود مجھ پر نازل ہونے والی تھی۔ لیکن ہاتف کی غلطی سے (غلط بخشی سے نہیں) قاسمی صاحب پر نازل ہو گئی! قاسمی صاحب مجھے معاف فرمائیں۔

اشفاق احمد

میری نثر کا درجہ بھی شاعری سے کمتر تسلیم کیا گیا ہے' پھر شاعری میں کچھ میرے ساتھی اور ہمعصر جب دست بستہ نعت کی وادی میں اتر گئے تو ان کی خوش بختی پر ہم کو رشک آیا اور اپنی کم نصیبی کا شکوہ بھی ہوا لیکن پھر اس عطا کو عطائے ربانی سمجھ کر تسلیم کر لیا گیا ------

آج میں اپنے دل کی بات آپ کے سامنے رکھ ہی دوں کہ مجھے اس حقیقت کا سچے دل سے اعتراف ہے کہ میری لکھنے والی برادری کے نعت گو شعراء بالعموم اور برادرم احمد ندیم قاسمی بالخصوص میرے جیسے لکھنے والوں سے بہت بلند اور اونچے مقام پر ہیں کہ وہ انعام یافتہ ہیں اور ان کا تعلق' بہت ہی اونچے بلکہ سب سے اونچے صاحب مقام سے ہے۔ میری آرزو ہے کہ جب ان کو وہاں سے یا یہاں سے داد ملے تو اس فخر و انبساط میں وہ ہم جیسے بے کس و بے حضور ساتھیوں کو ان کی تمامتر بے اثری اور بے ثمری کے باوجود اپنا ہی بندہ سمجھیں اور اس سفر میں ہمیں بھی اپنی اردل میں ساتھ رکھیں۔ آخر اتنے شرف کے تو ہم بھی خواہاں ہیں کہ تعلق رکھنے والوں کے ساتھ ہماری بھی واقفیت ہے' ہماری بھی شناسائی ہے۔

قتیل شفائی

احمد ندیم قاسمی کل بھی عظیم تھا' آج بھی عظیم ہے اور آنے والے کل میں بھی عظیم رہے گا۔ اس کی عظمتیں ہمارے ادب کا ایک اہم حصہ ہیں۔ اس کی عظمتیں انسانیت کے سنہرے زیور ہیں۔ اس کی عظمتیں آنے والی نسلوں کے لئے سنگ میل ہیں۔ وہ خود عظیم ہے۔ اس کی انسانیت عظیم ہے۔ اس کا فن عظیم ہے۔

پروفیسر فتح محمد ملک

ندیم کی عشقیہ شاعری کے ساتھ اردو شاعری نفسیات عشق اور کیفیات جمال کی ایک انوکھی دنیا میں داخل ہوتی ہے۔ ندیم ہمیں اس دنیا کی سیر کرانے میں اس لئے کامیاب ہوئے ہیں کہ ان کی حیات معاشقہ کا ان کی پوری زندگی سے نامیاتی علاقہ ہے اور ان کی دلچسپیاں شروع ہی سے سیاست سے لے کر مابعد الطبیعات تک پھیلی ہوئی ہیں۔ 41ء میں میرا جی نے ندیم کو ازلی مسرتوں کی ازلی منزلوں کا کھوج لگاتے دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ ندیم کی ذہانت زندگی اور موت کے مانند گہری ہے اور ندیم کی

زیر نظر عاشقانہ شاعری کے آغاز سے بہت پہلے اثر لکھنوی یہ فتوٰی صادر فرما چکے تھے کہ اگر ادب برائے زندگی سے مراد زندگی' نیز ادب کی ایک ہی جھلکیاں ہیں تو ادب اور زندگی دونوں کا بول بالا! جو لوگ ندیم کی سیاست سے دلچسپی پر برافروختہ ہیں ان کا خیال کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اگر ندیم کی دلچسپیوں کا دائرہ اس قدر وسیع نہ ہوتا تو ان کی عشقیہ شاعری اتنی پر عظمت نہ ہوتی نہ ان کا عشق اتنا گرانمایہ ہوتا۔

جمیل الدین عالی

پاکستان کے کچھ ادیب ہر قیمت پر بھارتی حلقوں میں پاپولر رہنا چاہتے ہیں اور رہتے بھی ہیں۔ یہ میکنزم کچھ ایسا ہے کہ وہ یہاں بھی غیر مقبول نہیں ہو پاتے اور وہاں بھی نمبر بڑھائے جاتے ہیں۔ کچھ اس کا سبب ان کی ٹیلنٹ بھی ہے۔ لیکن بڑا سبب "آفاقیت" کی چھتری ہے۔ قاسمی صاحب کسی سے کم آفاقی نہیں۔ مگر اپنی پاکستانیت کو باعث عار نہیں سمجھتے۔ جب بھارت ظلم کرے' کھلا احتجاج کرتے ہیں۔ وہاں کے ایسے ادیبوں سے بھی بجڑ جاتے ہیں جو ان کے ہم مسلک اور پرانے دوست ہیں۔

عبدالرحمٰن چغتائی

مجھے ندیم قاسمی سے ایک ذاتی لگاؤ ہے اور اس کا ایک ہی سبب ہے کہ مجھے ان کے فن کا پورا پورا اعتراف ہے ...... علم و ادب میں وہ کون سا جذبہ ہے جو ان کی بصیرت سے اوجھل ہے ...... احمد ندیم قاسمی اصلاح اور تنقید کے سلسلے میں ایک ایسے شدید جذبے کے مالک ہیں کہ ان کے قلم کے سامنے آیا ہوا' سانس بھی نہیں لے سکتا۔ ان کا عزم ثقافتی قدروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ ان کی ہر تحریر واضح ہے۔ ان کے سامنے ایک عظیم مقصد ہے۔

مجتبٰی حسین

"خندہ پیشانی" کے ایک معنی تو لغت کے بے جان صفحات میں ہیں۔ دوسرے معنی احمد ندیم قاسمی کا چہرہ ہے۔ بھی خاموش کبھی بولتا ہوا۔ مگر ہر "صورت" میں خوش آمدید کہتا ہوا۔ کتابی۔ ایسا کہ ہر لفظ ' ہر سطر پڑھ لیجئے۔ کہیں مجلک نہیں' کہیں تنقید نہیں۔ آنکھوں میں وہی روشنی جو پیشانی پر۔ لبوں پر افسانہ' غزل اور اس سوال کا تسکین آمیز جواب جو ابھی آپ کے دل میں ہے۔

ندیم سے مل کر پریشانی کم ہو جاتی ہے۔ بے گھری' در و دیوار بنانے لگتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دھوپ ڈھل رہی ہے' درختوں کا سایہ بڑھ رہا ہے۔

فیض احمد فیض

ندیم صاحب جو کام بھی کرتے ہیں۔ شاعری ہو یا صحافت' دوستی ہو یا وضعداری (دشمنی تو وہ خیر کرتے نہیں) انکسار ہو یا افتخار' لطیفہ بازی ہو یا بیان بازی ——— ہمیشہ اس بے تکلفی سے اور بلا ارادہ کرتے ہیں جیسے پہلے سے اسی پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔

مجنوں گورکھپوری

ان کی شاعری زندہ رہنے اور مقابلے کرنے کی تاب پیدا کرتی ہے۔

رفعت مرتضٰی

اس وقت ہم یہ خراج تحسین قاسمی صاحب کو ہی نہیں بلکہ اس پوری ایک نسل کو پیش کر رہے ہیں جس نے حالات کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا' جو کبھی زندگی میں اپنے اصولوں سے ہٹے نہیں اور ادب کے ذریعے' ایک نسل کی تربیت کرتے رہے ہیں۔ وقت ایسے لوگوں کو کبھی بھولے گا نہیں اور وہ آنے والے زمانوں میں بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

نجم الحسن رضوی

ندیم کے شعر و افسانے کا سارا سرمایہ ان کی انسان دوستی کے جذبے سے معمور ہے اور انہوں نے اپنی ساری زندگی اعلیٰ انسانی اقدار کے تحفظ اور سربلندی کے لئے ایک انتھک قلمی جہاد میں گزاری ہے اور شعر و ادب' صحافت اور فکر و فن کی کھیتیوں کو ان سب نہروں سے سینچا ہے جو ان کے تخلیقی ہنجد سے نکلی ہیں۔

کومل جذبوں کے شاعر نصیر احمد ناصر کے دو شعری مجموعے

"دسمبر اب مت آنا"
(نظمیں اور غزلیں) اور

"زرد پتوں کی شال" ہائیکو شائع ہو گئے ہیں

مطبع= پرنٹ اسٹائل 10۔ اے پوٹھوہار پلازہ بلیو ایریا اسلام آباد

فون: 814926

موت کی وادی میں پہلی رات

معروف مزاح گو شاعر اور برطانیہ میں "چہار سو" کے معاون خصوصی جناب غلام علی بلبل دوسری عالمی جنگ میں "برٹش انڈین آرمی" کی صفوں میں شامل رہے۔ وہ ابتدا میں پہلے برما اور ہندوستان کی سرحد اور بعد میں برما کے اندر جنگ کے آگ اور دھوئیں سے گزرے۔ انہوں نے اپنی "جنگی ڈائری" کے چند اوراق "چہار سو" کو عطا کئے ہیں اور اس واقعے سے ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کا اندازہ ہو گا کہ بعض واقعات --- افسانوں سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔

(گلزار جاوید)

انڈین آرمی کی سترہویں ڈویژن کی 15 ہزار نفوس سے زیادہ تعداد پر مشتمل فوج جاپانی فوج کے نرغے میں آگئی۔ جاپانی فوج کے 33 اور 23ویں ڈویژنوں کے محاصرے سے ہمارے سارے راستے مسدود ہو گئے۔ ہم نے سنگ میل نمبر 160 (ایک سو ساٹھ) پر سامان جنگ کے ذخیروں اور اسلحہ خانوں کو نذر آتش کیا۔ تاکہ دشمن ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اور دس میل پیچھے ہٹ کر سنگ میل نمبر 150 پر پڑاؤ ڈالا۔ یہ خوبصورت وادی دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ ہرے جنگلات۔ خود رو پھول۔ ایک گنگناتی ندی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ وادی قدرت کی فیاضیوں کی آماجگاہ ہے۔ مگر اس حسین وادی کا نام آج ہی غیر سرکاری طور پر "وادی موت" رکھا گیا۔ شاید اس لئے کہ یہاں سے بچ کر نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ہماری غیر لڑاکا فوج اپنی اپنی یونٹوں کے ساتھ اس وادی اور اس کے پہاڑوں کے مورچوں میں زندہ درگور ہو گئی۔ ہر سپاہی اور افسر نے ایک دوسرے کی مدد سے اپنا اپنا مورچہ کھودا۔ اور اس میں پناہ لی۔ ہمیں مورچہ کھودنے میں بڑی دشواری پیش آئی کیونکہ زمین بہت پتھریلی تھی۔ اور مجھے بار بار یاد آیا کہ۔

مقدر میں جو سختی تھی وہ مرکر بھی نہیں نکلی
لحد کھودی گئی میری تو پتھر کی زمیں نکلی

ہم تین آدمی تھے۔ ہم تینوں نے مل جل کر ایک مورچہ کھودا اور بہ مشکل اس مورچے میں سما سکے۔ کیپٹن "ٹرانز" انگلستان کے شہر مانچسٹر سے تعلق رکھتا تھا۔ لیفٹنٹ "نجمی" مدراس کا رہنے والا تھا۔ اور میں جنت کشمیر کا ساکن۔ شام ہوتے ہی گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ساری وادی اور اس کے سب مورچہ یا لحد نشیں مہمانوں پر خوف طاری تھا۔ موت سر پر منڈلا رہی تھی۔ دو طرفہ توپیں گرجنے لگیں۔ گولے برسنے لگے۔ فضا میں آگ کے شعلے رقصاں تھے۔ زمین دہلنے لگی۔ پہاڑ لرز رہے تھے۔ کسی فوجی کو یقین نہیں تھا کہ وہ صبح تک زندہ رہ سکے گا۔ ہر تین منٹ کے بعد اس وادی میں کہیں نہ کہیں بم کا گولہ گر جاتا سینکڑوں فوجی مر گئے۔ سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ ہمارے مورچے سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر ایک گولہ برسا۔ ایک دھماکا ہوا۔ پہاڑ کانپ اٹھا۔ ہمارے مورچے کی مٹی اڑنے لگی۔ اچانک کوئی چیز میری "گورکھا ہیٹ" کو چھو گئی۔ اور نجمی کی زبان سے چیخ نکلی کہ میرے بائیں بازو کو گولی لگی۔ ہم نے اس کے بازو کو ٹٹولا۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی قمیض کی چڑھی ہوئی آستین تر تھی۔ اندھیرے میں ہم نے اس کے بازو پر پٹی باندھ لی۔ نجمی ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ ہم اس کو برابر تسلی دیتے رہے۔ مگر بے سود۔ وہ کچھ دیر روتا اور پھر کچھ دیر خاموش رہتا۔ ہم برابر اسکی نبض دیکھتے جاتے۔ نجمی آہیں بھرتے ہوئے

کہنے لگا۔ دوستوں میں مرنے والا ہوں۔ موت میرے سامنے ناچ رہی ہے۔ میں اب زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکوں گا۔ سرکاری طور پر میرے مرنے کی خبر میرے گھر والوں تک پہنچ جائے گی۔ مگر تم لوگ بھی اپنا حق ادا کرو۔ میرے بیگ میں میری نوٹ بک ہے اس میں میرے والدین اور میری بیوی کے اڈریس درج ہیں۔ میرے والدین کو لکھنا۔ کہ میں آخری دم تک دشمن سے لڑتا رہا۔ اور ان کی محبت میری رہنمائی کرتی رہی ہے اور میری بیوی کو میری طرف سے لکھنا۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

ٹراٹر--- تھپی کی وصیت سے بڑا متاثر ہوا اور کہنے لگا۔ کہ اگر میں مرگیا اور آپ دو میں سے کوئی زندہ رہا تو میری والدہ کو لکھنا کہ مرتے دم تک میں انگلستان کے نام پر لڑتا رہا۔ میرے Haver Sack میں میری والدہ کے تین خط ہیں۔ ان میں اس کا ایڈریس ہے۔ میں نے "ٹراٹر" سے پوچھا کہ آپ کے والد صاحب زندہ ہیں کیا؟ اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ کہ کاش آپ یہ سوال نہ کرتے۔ اتنے میں ایک اور دھماکا ہوا۔ پہاڑ پھر لرزنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد "ٹراٹر" نے اپنے خیالات پھر مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ میری ولدیت کا خانہ خالی ہے۔ میری ولدیت کا علم شاید میری والدہ کو بھی نہ ہو۔ کیونکہ اس کے درجنوں بوائے فرینڈ تھے۔ شادی کے بارے میں' میں پوچھنے والا ہی تھا مگر اس نے خود ہی کہا۔ میں شادی شدہ نہیں ہوں۔ میری ایک گرل فرینڈ تھی۔ اس کا آخری خط بھی میرے Haver Sack میں ہے۔ وہ بڑی بے مروت نکلی۔ اس نے خط میں لکھا ہے کہ تم مجھے اب بھول جاؤ۔ میں نے ہمسایہ قصائی کے لڑکے کے ساتھ شادی کرلی ہے۔ اس کے بعد ٹراٹر اور تھپی نے مجھ سے کہا۔ دوست اگر تم مرگئے اور ہم میں سے کوئی زندہ رہا تو ہم آپ کے بارے میں کس کو لکھیں۔ میں نے جواب دیا۔ کسی کو لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جس دن میں فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ میں اسی دن اپنے والدین اور رشتہ داروں کیلئے مرچکا ہوں۔

ساری رات آگ اور خون کی ہولی کھیلی گئی۔ موت کی دہشت طاری تھی۔ ایک ایک لمحہ مجسم قیامت تھا۔ مورچے کا یہ حال تھا۔ کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" ہر دس منٹ کے بعد ہم تھپی کی نبض دیکھتے اور اس کو تسلی دیتے رہے۔ رات آنکھوں میں کٹی۔ خدا خدا کرکے صبح کی روشنی کی پہلی کرن ہماری لحد میں جھانکنے لگی۔ اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکے۔ تھپی اوندھے منہ گر چکا تھا۔ ٹراٹر نے اسکی نبض پر انگلی رکھی۔ اچھل کر بولا۔ تھپی زندہ ہے۔ ہم نے اس کو آہستہ آہستہ جھنجھوڑا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پوچھا کہ ہم کہاں ہیں۔ ہم نے اس کے بازو پر سے باندھی ہوئی پٹی کھول دی۔ دیکھا تو زخم تو درکنار اس کے بازو پر کاٹنے کی چبھن تک کا نشان نہ تھا۔ ہوا یہ تھا کہ بم کے گولے کے دھماکے سے زمین ہلی۔ کنکر اڑے۔ جو میری گورکھا ہیٹ کو چھوتے ہوئے اس کے بازو کو لگے۔ پانی کی بوتل جس کا ڈھکن خوف اور بدحواسی میں کھلا رہا تھا۔ گر گئی اور پانی تھپی کے کپڑوں پر گرا۔ تھپی سمجھا۔ کہ اس کے بازو کو گولی لگی تھی اور اسی وہم سے وہ ساری رات مرتا رہا۔

اس کے کپڑوں پر جو پانی گرا تھا۔ ہم سب سمجھے کہ یہ اس کا خون تھا۔ موت کی وادی میں یہ ہماری پہلی رات تھی۔

کچھ تڑپنے میں کٹی کچھ آہ و زاری میں کٹی
رات کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی

زندگی کی اس المناک رات کی یاد دل میں ابھی تک تازہ ہے۔

کب وہ اپنی مرضی سے جاگتا کہ سوتا ہے
صدر مملکت تو اک ہیڈ کلرک ہوتا ہے

اردو شاعری میں طنز و مزاح کا پہلا

نشتر آباد

اکبر الہ آبادی کے بعد عظیم ترین طناز سید ضمیر جعفری کی

تازہ ترین زعفرانی نظموں کا طاقتور مجموعہ

سیاسی باکسنگ

پیش لفظ از= بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) گلزار احمد

ناشر= مکتبہ الفخار نمبر4 گلستان کالونی۔ راولپنڈی

فون= 581034

سفرنامہ: بحر اوقیانوس کے اس پار قسط ۱۲

محمد قیم جعفری

یرغمال کی رہائی

پچھلے چند دنوں سے اخبارات میں بڑا چرچا تھا کہ ایک امریکی پروفیسر جوسی ٹرنر (TURNER) کو جو 1987ء سے لبنان میں ایک شیعہ سیاسی گروپ کی حراست میں یرغمال چلے آ رہے ہیں' عنقریب رہا کیا جا رہا ہے۔ آج ان کی رہائی کی خبر آ گئی۔ پروفیسر کی بیوی خبر کے ملتے ہی بیروت پہنچ گئی۔ امریکی اخبارات نے اس خبر کو صفحہ اول پر شہ سرخیوں کے ساتھ اس دھوم دھام سے شائع کیا ہے کہ جیسے کوئی بہت بڑا قومی "ہیرو" دشمن کی قید سے رہا ہو کر وطن آ رہا ہو۔ امریکہ اپنے شہریوں کی زندگی کو کتنا قیمتی سمجھتا ہے۔ ملک بھر میں پروفیسر ٹرنر کے استقبال کے لئے کمیٹیاں قائم کر دی گئی ہیں۔

(22 اکتوبر)

دوسری السلام علیکم

محلے کے ڈاک خانے کو اندر سے بھی دیکھ لیا ---- عمارت جتنی باہر سے شاندار ہے' اتنی ہی اندر سے صاف ستھری اور مزین پائی۔ جیسے کسی "ائر پورٹ" کا لاؤنج ہو۔ "کاؤنٹروں" پر صرف تین "باپو خواتین" تھیں۔ ٹکٹ ڈیوڑھی میں نصب مشینوں سے خریدے جا سکتے ہیں۔ ڈاک خانے کے اندر صرف رجسٹریاں وصول کی جاتی ہیں۔ لوگوں کے بیٹھنے کے لئے صدر ایوان میں صوفے بچھے ہیں جن کے سامنے میزوں پر لکھنے کے لئے پنسلیں رکھی ہیں۔ دیواروں پر دنیا بھر کے ممالک کے معلوماتی طغرے آویزاں تھے۔ خود ڈاک خانے کے بارے میں معلوماتی اور انتباہی "چارٹ" جا بجا معلق کئے گئے تھے' جن سے معلوم ہوا کہ ڈاک خانے کی اپنی "پولیس فورس" موجود ہے۔ مقدموں میں مطلوب مفرور قاتلوں کے اشتہارات بھی "بورڈوں" پر بہت چسپاں دیکھے۔ مخبری کرو اور انعام پاؤ۔ ڈاک خانے کے ایک گوشے میں پرانے ٹکٹوں کی نمائش جی ہوئی تھی۔ جس کے "کاؤنٹر" پر خریداروں کی بھیڑ لگ رہی تھی۔ گویا نمائش کی نمائش اور دوکان کی دوکان۔ بھیڑ "رجسٹری کھڑکیوں" پر بھی تھی۔ مگر بے ترتیبی یا بے چینی کا شائبہ تک نہ تھا۔ لوگ قطاروں میں کھڑے تھے اور قطاریں تیزی سے آگے چل رہی تھیں ---- عمارت کی پیشانی پر محکمے کا نصب العین بجلی کے روشن لفظوں میں جگمگا رہا تھا۔

ہمارے ہرکاروں کو برف' بارش' گرمی' دھند ---- کوئی چیز خدمت سے روک نہیں سکتی۔

ڈاک خانے میں آج ایک اور اجنبی نے اچانک "السلام علیکم" کہہ کر ہمارے جسم کے روئیں روئیں میں خیر سگالی کی کلیاں چٹکا دیں۔ یہ ایک گورا چٹا نوجوان تھا۔ ہم اپنی خوشی کی جھنجھلاہٹ میں ---- "وعلیکم السلام" --- پورے عربی ادب آداب کے ساتھ کہنے نہیں پائے تھے کہ نوجوان نے کہا:

"میں ایرانی ہوں۔ کیا آپ فارسی میں لکھ رہے تھے۔ "ہم اس وقت صوفے پر بیٹھے خط لکھ رہے تھے)

"نہیں - یہ فارسی نہیں" ہم نے جواب دیا۔ "میں پاکستانی ہوں۔ میں اپنی قومی زبان اردو میں خط لکھ رہا ہوں"

وہ بولا:

"اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ملکوں کے رسم الخط مشابہ ہیں"

ہم نے کہا:

"اور بھی بہت چیزیں مشترک ہیں۔ مذہب' تاریخ' رہن سہن' شاعری ---- ہم نے کئی چیزیں گنوائیں تو اجنبی ایرانی نے فاقٹ کسی جدید ایرانی شاعر کے دو تین اشعار سنا دیے۔

جن میں سے ----"است و بود" وغیرہ ہی ہماری سمجھ میں آ سکے۔

ایرانی نوجوان نے باتیں کرتے ہوئے ہمارا ہاتھ تھام لیا تھا۔ پھر وہ ہاتھ تھامے تھامے ہمیں ڈاک خانے سے باہر لے آیا اور اپنائیت کی ایک عجیب لہر ہماری روح میں دوڑ رہی تھی کہ ہم اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیئے اس کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔

اب ہم نکھرے ہوئے آسمان کی خوش گوار نرم نرم دھوپ میں ---- ڈاک خانے کے چمن زار میں بچھے ایک "بینچ" پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے وہ انجینئر تھا۔ عمر یہی کوئی پینتیس چھتیس برس ہوگی۔ پوشاک عام امریکنوں کی بہ نسبت زیادہ نستعلیق تھی۔ بظاہر آسودہ اور خوش و خرم

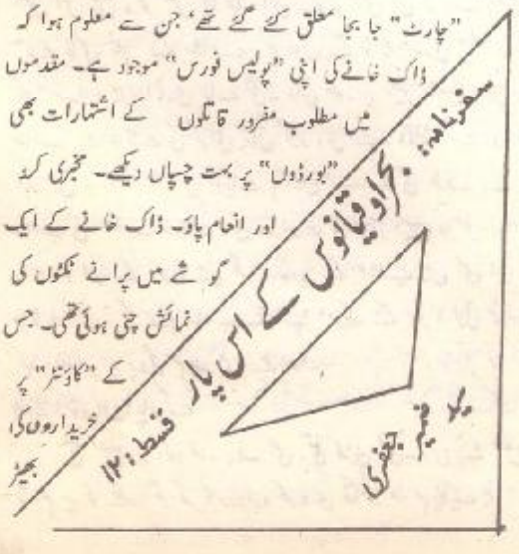

شخص معلوم ہوا مگر ---- "قیس" تصویر کے پردے" سے بہت "پریشان" نکلا۔ عجیب کہانی سنائی اس نے۔

"میں اٹھارہ برس کا تھا جب طہران سے امریکہ آ گیا۔ آتے ہی ایک امریکی لڑکی سے شادی کر لی۔ تمدن مختلف۔ مزاج مختلف۔ میں ہر چند کوئی کٹر مذہبی آدمی نہیں تھا۔ مگر نہ سور کھاؤں نہ "اسکو" ناچوں۔ وہ ناشتے میں بھی سور کھائے۔ جوانی کی ترنگ کچھ روز ہی میں ڈھیلی ہوئی تو میرے جسم اور میری روح ------ میرے گاؤں اشت اور نیویارک ---- کے درمیان سخت گھمسان کی خانہ جنگی شروع ہو گئی ---- نباہ ناممکن ہوا تو نوبت طلاق تک جا پہنچی۔ اس کے بطن سے ایک بچی ہے' جو اسی کی تحویل میں ہے۔ وہ حرافہ مجھے بچی سے ملنے بھی نہیں دیتی۔ اس وقفے میں دو برس کی قید بھی بھگت چکا ہوں"۔

"ہم تو گھر سے پیدل ٹہلتے ٹہلتے ڈاک خانے تک آئے تھے۔ واپسی پر یہی ایرانی دوست ہمیں اپنی موٹر میں گھر تک پہنچانے آیا۔ راستے میں امریکہ پر مسلسل برستا گیا ------ عجیب معاشرہ ہے۔ اگر کوئی کام جلد کرو تو مشکل ہو جاتا ہے۔ اور دیر سے کرو تو ناممکن ہو جاتا ہے ہم جیسے لوگ یہاں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہم کنوئیں میں بیٹھکر سودا بیچتے ہیں اور یہ لوگ درخت پر چڑھ کر یہ ایک ایسا ملک ہے جہاں خواہشات کا نہ پورا ہونا بھی المیہ اور پورا ہونا بھی المیہ۔ الغرض ایک سے ایک افسردہ اور مشتعل کرنے والی بات"

"ہمارے گھر کے سامنے موٹر روک کر موٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے علی نے خدا حافظ کہتے ہوئے کہا۔

"آغا جان۔ خدا اگر یہاں کبھی شادی کا اشتہار دے بیٹھو۔ ہزاروں شوہروں کی طرف سے ٹیلی فون خطوط اور تار برقیوں کے ذریعے درخواستوں کا انبار لگ جائے گا کہ خدارا ہماری بیوی لے جاؤ"

علی نے جب موٹر کا دروازہ بند کیا تو اس کی آواز کے ساتھ خود ہمارے دل میں سے بھی کچھ ایسی آواز آئی جیسے کوئی دروازہ بند ہو رہا ہو۔

(23 اکتوبر)

ریڑھ کی ہڈی

آج کے اخبار کی "شہ سرخی" نے حیران کر دیا خبر مکانوں کے کرایوں سے متعلق تھی۔ لکھا تھا کہ کرائے کی "چھلانگ" نے ایک ہی جست میں گزشتہ دس برسوں کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ اور یہ "چھلانگ" متوسط طبقے کی کمر توڑ دے گی۔ مشرق وسطی کی "امن کانفرنس" مذاکرات کے میز پر دم توڑ رہی ہے ملک میں قتل و غارت کی وارادات میں تشویشناک اضافہ ہو رہا ہے۔ مگر اخبار نے سب سے زیادہ اہمیت متوسط طبقے کی "کمر" کو دی ہے کہ وہی تو قوموں کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔

حمیرا رحمن

نیویارک سے حمیرا رحمن نے اپنے سات دسمبر کے "خضر زیری" مشاعرے کے ضمن میں ہماری تصانیف اور زندگی کے بارے میں کچھ کوائف طلب کئے ہیں۔ کتابوں کی فہرست تو خیر ہم نے آج ہی بھیج دی۔ رہے سوانح حیات تو ہم ان لوگوں میں سے ہیں' جن کی عمر ہوتی ہے مگر سوانح عمری نہیں ہوتی۔ حمیرا نے لکھا ہے کہ نیو یارک کے علاوہ امریکہ اور کینیڈا کے بعض شہروں میں بھی مشاعروں میں شرکت کے لئے آمادہ رہیے۔ تقریباً ایک مہینے کا مسلسل سفر ہوگا مشاعرے پر مشاعرہ۔ ٹیلے پر دہلا۔ جی خوش ہوا۔ ڈیور پہاڑی مقام ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر تنہائی اور بڑھ جاتی ہے۔ کسی وقت یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم یہاں موٹروں کا تیل بدلوانے آئے ہیں۔ ہم حمیرا اور رئیس وارثی کی نیکی کی قیمت تو پہلے کیا ادا کرتے۔ ہم نے فوراً شکرانے کا خط لکھ دیا کہ ہم نے آج ہی سے سفر کے لئے کمر باندھ لی۔

ٹیلی فون پر حمیرا سے سولہ نومبر کے مشاعرے کی بات بھی ہوئی۔ حمیرا نے بتایا کچھ مشاعرہ تو ہوا۔ ندیم قاسمی صاحب بھی تشریف لائے۔ مگر ہمیں اس میں مدعو نہیں کیا گیا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جب شعراء کی "ندیم قاسمی ٹیم" کے مشاعرے ختم ہوں گے تو پھر ہماری "محشر بدایونی ٹیم" میدان میں اتاری جائے گی۔ ذاتی طور پر ہمیں امریکہ میں ندیم صاحب سے ملاقات کی گرامی شاق گزر رہی ہے۔ 25 اگست کو اسلام آباد میں ---- "اکادمی ادبیات پاکستان" ---- کی طرف سے ندیم صاحب کی "تقریب ملاقات" کی صدارت کا اعزاز ہمیں حاصل ہوا تھا۔ رات کو ان کے اعزاز میں گلزار جاوید کے عشائیے میں بھی ان سے ملاقات رہی۔ مگر ندیم صاحب نے اپنے امریکہ کے سفر کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ غالباً یہ یہ پروگرام بعد میں طے ہوا۔

(23 اکتوبر) ویسٹ پارک

صبح مطلع ابر آلود تھا۔ برف بھی تھلی کھڑی تھی۔ دس بجے مطلع کھلا تو ہم سیر کو نکلے۔ مگر گھر کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ موسم یکایک پھر "بند"

ہو گیا۔ لیکن ہم پر بھی آفریں کہ ہم ہراساں نہیں ہوئے۔ پیش قدمی جاری رہی۔ اس باغ سے بارہا گزرے ہیں مگر اس کے نام کی تختی پر آج ہی نگاہ پڑی -----"وینا پارک" ----- نام پیارا لگا۔ مشرق کی خوشبو آئی۔ اس کے نام سے ہمیں کوئٹہ اور گلگت کے ----- "سرینا ہوٹل" ---- یاد آگئے۔ "وینا پارک" موسم خزاں کے زرد پتوں سے بھرا ہوا تھا۔ درخت اداس اداس معلوم ہوئے ----- کسی شے کو بھی بے لباس ہونا پسند نہیں۔

ڈینور اداس ہے

"کالو راڈو" کی ریاست نے ایک "ٹھیکے" کی بولی دے رکھی تھی۔ "بولی" اس کے نام نکلی' جس پر ڈینور کے لوگ بہت افسردہ ہیں۔ قصہ یوں ہے کہ امریکہ کی ایک بڑی "فضائی ایئر لائن" ---- (یونائیٹڈ) امریکہ کی کسی ریاست میں اپنا "مرمت مرکز" قائم کرنا چاہتی ہے۔ فضائی کمپنی نے اشتہار دیا تو ملک کی کئی ریاستوں نے "بولیاں" لگائیں کہ اگر یہ مرکز ہمارے ہاں قائم کیا جائے تو ہم فلاں۔ فلاں سہولتیں کمپنی کو فراہم کریں گے۔ ریاست "کالوراڈو" کی پیشکش بھی اگرچہ بہت فراخدلانہ تھی۔ مگر آخری بولی ----- ریاست "انڈیانہ" کے نام نکلی۔ اب "انڈیانہ" میں' اس کامیابی پر جشن مسرت برپا ہے اور "کالوراڈو" میں صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔ کیونکہ جہاں کہیں یہ مرکز قائم ہوگا وہاں روزگار کی بارہ ہزار نئی آسامیاں نکل آئیں گی۔

ہم نے اس واقعے کو اس لئے بھی قابل ذکر جانا کہ جناب انوار احمد کے بقول' جو ڈینور میں کسی ایک بین الاقوامی فضائی کمپنیوں کی نمائندگی کرتے ہیں' چند برس قبل دنیا کی ایک بہت بڑی فضائی کمپنی نے ایک ایسا ہی مرکز کراچی میں کھولنا چاہا۔ تو ہماری حکومت نے' اس سنہرے موقعے کی طرف' جو بار بار دروازے پر دستک نہیں دیا کرتا' آنکھ اٹھا کر دیکھنے تک کی فرصت نہ لی۔

(24 اکتوبر) خط در خط

اسلام آباد سے برادرم سید ریاض حسین جعفری کا خط ملا۔ خط کے ساتھ ایک اور خط "ٹیکسٹ بک بورڈ حیدر آباد" کے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا منسلک ہے۔ "انٹر میڈیٹ" کے اردو نصاب میں شامل کرنے کے لئے مجھ سے کوئی نظم طلب کی گئی ہے۔ ان کی یاد فرمائی کا شکریہ مگر میرے پاس ویسے ہی اپنی کتابیں کہاں ہوتی ہیں جو یہاں ہوں۔ "مشاعراتی بیاض" میں جو کلام یہاں موجود ہے' وہ حکومت اور اخلاق کے نام نہاد ٹھیکیداروں کے لئے ناقابل برداشت ہوگا۔ کہ ان اشعار سے تو محبت کی خوشبو آئے گی۔ اور محبت کو "ٹھکے" کی اجازت ہم اپنے طالب علم کو بی اے ایم اے تک نہیں دے سکتے۔ "انٹر میڈیٹ" کی "بالی عمریا" میں کیا دیں گے۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ ہمارے ریاض بھائی اتنا دلچسپ خط لکھتے ہیں۔ ملک کے کوائف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ----- ہم بن گئے ہیں۔ بیسے بنائے گئے ہیں۔" ایک معاملے میں ہمیں مشورہ دیتے ہوئے از راہ معذرت ارشاد ہوا ----- ہمارے ہاں مشورہ مانگا نہیں جاتا ----- دیا جاتا ہے" ----- خط کے نکات الگ الگ ترتیب وار ہوتے ہیں۔ مبادا ایک نکتہ دوسرے نکتے میں گھس جائے۔ کیوں نہ ہو کہ آخر کمشنر کی حیثیت سے ساری عمر "شناخت پریڈوں" میں گزری ہے۔

چوہدری رشید

کیلگری (کنیڈا) سے چوہدری رشید صاحب نے ٹیلی فون پر خیر خبر دریافت کی۔ بڑی محبت سے کنیڈا آنے کی دعوت دی۔ آپ کینڈا کے پاکستانیوں کی فیڈریشن کے پریذیڈنٹ ہیں۔ رشید صاحب ہمارے عزیز دوست (بین الاقوامی شہرت کے اسکالر اور دانشور) ڈاکٹر انور نسیم کے گہرے دوست ہیں۔ پاکستانیوں کی فیڈریشن کی داغ بیل ان دونوں دوستوں ہی نے مل کر ڈالی تھی۔ ابتداء میں انور نسیم ہی کئی برس تک اس تنظیم کے صدر بھی رہے۔ "فیض فاؤنڈیشن" میں بھی چوہدری صاحب ---- ڈاکٹر صاحب کے دست راست رہے۔ کہنے لگے۔ یہاں اقبال حیدر صاحب نومبر کو ایک مشاعرے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی آ رہے ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر آپ بھی آ جائیں۔ جی تو بہت چاہا۔ مگر "ویزے" کے مراحل طے ہوتے دکھائی نہ دیئے۔ ویزا ----- نیویارک سے ملتا تھا۔ افسوس رہا۔ مشاعرے میں عدم شرکت کا بھی اور رشید صاحب کے ہاں ان کی اپنی گائے کے گھی کے "گوجر خانی پراٹھوں" کی لذت سے محرومی کا بھی۔

آج ہی نیویارک سے ڈاکٹر شاہد صاحب نے ٹیلی فون پر یکم اور دو نومبر کو نیو جرسی میں اپنے مشاعرے (بلکہ مشاعروں) میں شرکت کی دعوت دی۔ بتا رہے تھے کہ حضرت محشر بدایونی اور جناب سرشار صدیقی تو کراچی سے پہنچ چکے تھے۔ امریکہ میں مشاعروں کی بڑی ریل پیل ہے۔ 1981ء میں جناب قتیل شفائی۔ جناب حمایت علی شاعر اور ہم نیو یارک میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں ٹھہرے تھے۔ ٹیلی فون پر ان کی آواز سن کر ان کی کریمانہ مسافر نوازی کے نقوش دل میں تازہ ہو گئے۔

ڈاکٹر مرگ

امریکہ میں ان دنوں یہ بحث چل رہی ہے کہ انسان کو ناقابل علاج علالت یا ناقابل برداشت جسمانی ذہنی اذیت میں قانونی طور پر اپنی زندگی ختم کرنے کا حق ہونا چاہیے یا نہیں بعض لوگوں کا موقف ہے کہ زندہ رہنے یا نہ رہنے کا مسئلہ ایک فرد کا ذاتی مسئلہ ہے۔ اگر آدمی اپنی زندگی کا فیصلہ بھی خود نہیں کر سکتا تو اور کونسے فیصلے کر سکے گا۔ مگر اس کے برعکس مذہبی خیالات کے لوگ زندگی کو قدرت کی ایک مقدس امانت سمجھتے ہیں۔ "خود کشی" کو وہ قدرت کے کاموں میں مداخلت بے جا کے مترادف سمجھتے ہیں۔

اس ملک میں یہ کوئی نئی بحث نہیں ہے۔ اس وقت امریکہ کی 27 ریاستوں میں خود کشی جرم ہے۔ بلکہ خود کشی میں کسی آدمی کی اعانت بھی ایک سنگین جرم ہے۔ لیکن باقی ریاستوں میں جینے مرنے کی صلاح عام ہے۔ جو زندہ رہنا چاہتا ہے۔ زندہ رہے۔ جو مرنا چاہتا ہے شوق سے مرجائے ----- اپنی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے!

اس پرانی بحث میں از سر نو شدت پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ "مشی گن" کے ایک ڈاکٹر صاحب اپنی ایجاد کردہ ایک مشین کے ذریعے سے موت کے خواہشمند مریضوں کو دھڑا دھڑ ابدی نیند سلانے لگ گئے ہیں۔ تریسٹھ سالہ "ڈاکٹر کیوریان"۔ (KEVERIAN) کی مشین اس قدر سریع التاثیر ہے کہ مرنے کے لئے مریض کو بس اس کا ایک بٹن دبانا پڑتا ہے۔ اور مریض آنکھ جھپکنے میں اتنی آسانی سے زندگی کی سرحد عبور کر جاتا ہے کہ اس کو اپنے مرنے کی آہٹ تک محسوس نہیں ہونے پاتی۔

اس ریاست میں خود کشی جرم نہیں۔ تاہم اس مشین کے ذریعے خود کشی کے "تھوک کاروبار" پر ملک میں رد عمل روز بروز شدت پکڑ رہا ہے۔ اخبارات نے اس ڈاکٹر کو ----- "ڈاکٹر مرگ" ----- کا نام دے رکھا ہے۔ ادھر ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ لوگو تم نے یہ کیا لایعنی شور و غوغا بلند کر رکھا ہے۔ میں انہیں لوگوں کو مارتا ہوں جو بہ رضا و رغبت خود مرنا چاہتے ہیں۔ اور وارثان بازگشت کی منظوری کے ساتھ تحریری درخواست دیتے ہیں۔ کبھی "کلینک" پر تشریف لا کر ----- شائقین مرگ ----- کی لمبی لمبی قطاروں کو تو دیکھئے!

"ہمارے کسی شاعر نے کیا سچ کہا ہے کہ

موت کیا ایک لفظ بے معنی
جس کو مارا حیات نے مارا

(25 اکتوبر)

اکرام کی کمائی اور رحمان کی بیوی میرے لیے ہمیشہ باعث کشش رہی ہیں۔ بھوکا ننگا میں بھی نہیں بیوی دس عورتوں سے کم تر ہے تو سو سے برتر مگر انسانی فطرت کا کیا کیجیے جس میں دوسرے کی بیوی اور کمائی کے لیے تجسس و اشتیاق پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے ہمارے بزرگوں نے دور کے ڈھول سہانے والا محاورہ ایسی ہی صورتحال کے لیے گھڑا ہو لفظ گھڑا میں نے جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ کیونکہ بنانے اور گھڑنے میں جو فرق پایا جاتا ہے اس میں انسانی فطرت کی دو متضاد خاصیتیں پوشیدہ ہیں۔

بنانے میں تخلیق کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور گھڑنے میں وقتی تسکین کا چند ضرب المثل ضرورت ایجاد کی ماں ہے بہتی گنگا میں ہاتھ دھولو۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ انسانی ذہن کی اضطراری کیفیت کی نشان دہی کے لیے کافی ہیں۔

اضطراری کیفیت پر یاد آیا۔ آج کل میری طبیعت میں یہ کیفیت کچھ زیادہ ہی پائی جاتی ہے زندگی کی ساعتیں مختصر لگنے لگی ہیں۔ جلد بہت کچھ بلکہ سب کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ہوس عزت' دولت' شہرت ہر چیز کی ہے۔ لطف اندوز کسی سے بھی نہیں ہو پاتا کھاتا ہوں مگر ذائقہ نہیں۔ نوالے اس طرح پیٹ میں بھرتا ہوں جیسے حرام کی کمائی تھیلے میں ہوتا ہوں اس طرح جیسے پیٹھ کے نیچے نرم آرام دہ گدے کے بجائے کانٹوں کی سیج بچھی ہو۔ اہل خانہ کا ناطقہ الگ بند رکھتا ہوں۔ جس اچھی بات پر میں خوش ہوتا ہوں کچھ دیر بعد وہی بات میری برہمی کا سبب بن جاتی ہے۔

آپ یہ سوچنے پر حق بجانب ہیں اگر میں بیمار ہوں تو ڈاکٹر سے رجوع کیوں نہیں کرتا حکیم کی کڑوی کسیلی معجون کے علاوہ جلی کٹی باتوں میں شفا تلاش کیوں نہیں کرتا۔

میرے محسنوں میں یہ سب کچھ بہت پہلے کر چکا ہوں۔ شہر کے مشہور ڈاکٹروں حکیموں کے علاوہ ملک کے نامور طبیبوں سے رجوع کرنے کا نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات کوئی گولی کیپسول انجکشن یا معجون مجھے صحتیابی سے ہمکنار نہ کر سکی الٹا کثرت استعمال سے مزاج میں چڑچڑا پن عود کر آیا۔

آج کل شہر کے نامی گرامی پیروں فقیروں اور عاملوں کا تختہ مشق بنا ہوا ہوں۔ کوئی میرے سر سے جن اتارنے کے چکر میں ہے اور کوئی بھوت برآمد کرنے کے درپے کسی کو بلا کا سایہ نظر آتا ہے تو کسی کو ستارے گردش میں۔

البتہ ایک صاحب نے علاج سے قطع نظر ایک نسخہ بڑا کارگر بتایا کہ خواب میں جو بھی دیکھئے جس سے بھی ملنے کی خواہش ہو سونے سے پہلے ذہن میں اس کی تصویر تازہ کرو اور اسی کے متعلق سوچو۔ چونکہ آجکل ہماری سوچوں کا محور اسی بیماری کے گرد گھومتا ہے۔

اس رات ہم خود کلامی کے انداز میں بڑبڑا رہے تھے۔ کس قسم کی بیماری ہے جانے کا نام نہیں لیتی یہ بیماری کم بخت زیادہ ہے۔ کاش اس سے میری ملاقات ہو سکتی تو میں پوچھتا بھلی مانس میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے کیوں پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑی ہے۔ میرے علاوہ کوئی اور نہیں ملا تجھے ستانے کو۔ نہ معلوم اس دوران کب آنکھ لگی اور کب وہ کافر ادا ہمارے روبرو آ بیٹھی پہلے تو ہم کن انکھیوں سے اسے تکتے رہے ہماری اس حرکت کا اس نے برا نہ منایا تو ہم نے باقاعدہ آنکھیں لڑانا شروع کر دیں اس کا جواب بھی حوصلہ افزا ملا تو ہم نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ محترمہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئی ہیں۔ ہمارے استفسار پر اس نے شان بے نیازی سے بھرپور انگڑائی لی جس سے اس کا انگ انگ چیخ گیا ہماری اشتہا سر ابھارنے لگی۔

ابھی آپ مجھے یاد فرما رہے تھے بندی حاضر ہوئی تو آپ پہچاننے سے انکاری ہیں۔ ہم نے کہا محترمہ جس موذی بیماری کے ہاتھوں ہماری زندگی اجیرن ہو چکی ہے ہم تو اسے کوس رہے تھے۔

تو کوسیئے ناجی بھر کے کوسیئے کوّں کے کوسنے سے ڈھور ڈنگر مرتے نہیں۔

آپ بیماری ہیں؟

اس نے اثبات میں سر ہلایا
دی جس نے ہمیں زندہ درگور کر رکھا ہے
اب کیا حلف اٹھوائیے گا حضور میں نے عرض کیا نہ آپ نے یاد فرمایا اور کنیز حاضر ہو گئی

آپ کا نام کیا ہے۔ کیا بگاڑا ہے میں نے آپ کا مجھے اس طرح اذیت پہنچانے سے آپ کو کیا حاصل ہو گا۔

دیکھئے دیکھئے اتنے ڈھیر سارے سوالات کے اکٹھے جواب دینا میرے بس میں نہیں باری باری آپ کے سوالات کے جواب دینا ممکن ہے۔

مگر اس وقت تو مجھے آپ کی جہالت پر رونا آ رہا ہے کوس رہی ہوں اس وقت کو جب میں نے آپ کو اپنے حصار میں لیا تھا کتنے بدذوق ہیں آپ ابھی تک میرے نام سے بھی واقف نہیں حالانکہ ہمارا زندگی بھر کا ساتھ ہے میں تو آپ کی سوسائٹی کا اہم جزو ہوں میرے بغیر معزز اور ماڈرن کہلانے کا آپ کو اختیار ہی نہیں۔

کیا کہا آپ نے زندگی بھر کا ساتھ ہے اس کا مطلب ہے یعنی آپ اب میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گی آپ سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی طریقہ تو ہو گا۔

طریقے تو کئی ہیں عمل کرنا مشکل ہے۔ ایک دفعہ جو میرے دام میں پھنس گیا سو پھنس گیا۔ اگر آپ ململ کا کپڑا بیری کے درخت پر ڈال کر صحیح سالم واپس اتار سکتے ہیں۔ یا پکوں سے سوتی چنے کا فن آپکو آتا ہے۔ تب تو مجھ سے چھٹکارا پانا ممکن ہے۔ وگرنہ میں اپنی برادری کی بڑی سرپھری اور منہ زور ہوں۔ میرا طریقہ واردات سب سے مختلف انوکھا اچھوتا اور جداگانہ ہے۔ جلد بازی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

میرا کزن ہے نا بخار مجھے بہت چھچھورا لگتا ہے۔ رات کو دبوچتا ہے اور صبح لاغر کر دیتا ہے ایک دن تین دن یا سات دن میں اسپرین جیسی سستی دوائی سے ڈر کر بھاگ جاتا ہے۔ اگر ہمت کر کے بھائی ٹائیفائیڈ کو ساتھ ملا بھی لے تو زیادہ سے زیادہ ایک مہینہ گزار کے کلوروما ئی سی ٹین جیسی بودی دوائی کے ہاتھوں شکست کھا جاتا ہے ایک اور کزن بھی ہے میرا بلڈ پریشر یہ ذرا جی دار ہے۔ جہاں ایک دفعہ ڈٹ جائے ہلنے کا نام نہیں لیتا ڈراتا ہے۔ گھبراتا ہے مارتا کم ہے۔ ایک میری کزن اور پکی سہیلی کا نام شوگر ہے۔ واہ واہ بڑی شیر دل ہے۔ جس سے بھی یاری لگاتی ہے پکی لگاتی ہے پہلے پہل اس کا شکار بوڑھے ہوا کرتے تھے اب تو جوانوں کو بھی پھانسنے لگی ہے برف کی طرح گھلانے کے بجائے مصری کی طرح حل کر کے مارتی ہے مزے لے لے کر۔

کمال کرتی ہیں آپ تمام بے ضرر بیماریوں کے نام لئے چلی جا رہی ہیں۔ اور ہارٹ اٹیک جیسی خوفناک بیماری آپ کو یاد نہیں۔

ارے ارے ارے یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ یہ ہماری برادری کی رکن ہے یہ تو صرف ایسوسی ایٹ ممبر ہے۔ اسے بیماری کہلانے کا کوئی حق نہیں۔ شاید آپ کی نظر سے دل کے سب سے بڑے ماہر کی یہ رائے نہیں گزری کہ آپ تمام لوگ صرف بیس منٹ روزانہ پیدل چلنا شروع کر دیں۔ تو دل کے مریضوں کی تعداد گھٹ کر صرف دس فیصد رہ جائے گی۔ بھلا بتائیے سوچئے ذرا جو بیماری بیس منٹ کی سیر سے ڈر خوف کھاتی ہو اسے ہماری برادری کا رکن کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ اسے تو آپ لوگ خوش خوراکی اور کاہلی کے سبب مہمان کیئے ہوئے ہیں۔

کینسر اور ایڈز جیسے خطرناک مرض سوری کزنز کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا۔

دیکھئے دیکھئے ان بے صبروں کا نام لے کر مجھے غصہ مت دلایئے انہیں رشتہ دار کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ وہ ہیں تو ہمارے خاندان سے مگر ان کی بے صبری نے ہمارے نام کو اسی طرح بدنام کیا ہے جس طرح بش کی بے صبری نے امریکہ کے نام کو

کمال ہے آپ کینسر اور ایڈز کو اہمیت نہیں دے رہیں حالانکہ ان کی بدولت دنیا کی آبادی تیزی سے گھٹنے لگی ہے۔

بھولے بھائی ہم آپ کی آبادی گھٹانا نہیں بڑھانا چاہتے ہیں آبادی گھٹانا ہمارا مقصود ہوتا تو ہیضہ چیچک بلیگ طاعون کو ہم نے اپنی برادری سے عاق نہ کیا ہوتا۔ ہم تو آپ پر آپ کی پوری آبادی پر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں۔ یہی ہمارا مشن اور یہی ایم ہے۔ اس سے ہماری انا کو تسکین ملتی ہے۔

دیکھ لینا کینسر کی بیتابی جلد اسے ہماری برادری سے خارج کرا دے گی ایڈز کی تیز رفتاری بھی خوش آئندہ بات نہیں سیدھی سی بات ہے جو جتنا تیز دوڑے گا اتنا جلد تھک جائے گا۔

ایک راز کی بات بتاؤں جس طرح آپ انسانوں میں دنیا پر حکمرانی کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ بالکل اسی طرح ہمارے درمیان بھی شدت سے یہ دوڑ جاری ہے۔ اور میں آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتی ہوں۔ دنیا پر آئندہ میری حکمرانی ہو گی صرف میری کوئی طاقت مجھے میرے مقصد سے باز نہیں رکھ سکتی۔

کوئی بھی طاقت آپ کو آپ کے ارادوں سے نہیں روک سکتی ہرگز نہیں۔

اس کا مطلب ہے آپ کسی سے نہیں ڈرتیں آپ کو کسی کا خوف

نہیں۔

نہیں نہیں یہ میں نے کب کہا مجھے ڈر بھی لگتا ہے مجھے خوف بھی آتا ہے۔

اچھا آپ کو ڈر بھی لگتا ہے اور خوف بھی آتا ہے مثلاً کس سے ڈرتی ہیں آپ

سچائی ایمانداری اعتدال اور قناعت پسندی سے میری جان جاتی ہے۔ مذہبی عبادت گاہوں سے میرا خون خشک ہوتا ہے اس لئے کہ وہاں میرا بس بالکل نہیں چلتا دنیا میں میرا واحد حریف اگر کوئی ہے تو فقط یہ عبادت گاہیں۔ جن کا تابناک مستقبل میری شکست کا باعث بن سکتا ہے۔

اچھا اب اجازت دیجئے مجھے اور بھی بہت کام کرنے ہیں۔

ذرا ٹھہریے تو اتنا کچھ بتا دیا اب نام بھی بتا دیجئے اپنا

سچ مچ آپ بڑے سادے ہیں اب بھی نہیں پہچانے

میں فیشن کا سمبل ہوں امارات کی نشانی ہوں مرتبہ کی علامت ہوں۔

میں ٹینشن ہوں ——— میں ڈپریشن ہوں

(16 نومبر 1992ء کو حلقہ ارباب ذوق اسلام آباد میں پڑھا گیا)

جدید لہجے کے نامور شاعر

افضل منہاس، کا تازہ مجموعۂ غزل

آبگینے میں سورج

خوبصورت انداز میں شائع ہوگیا ہے

صفحات ۱۹۲ قیمت: ۱۲۰ روپے

آئینۂ ادب،

چوک انارکلی، لاہور

دھلائی میں اوّل۔ صفائی میں اعلیٰ، ہمارے جدید پلانٹ پر تیار کردہ صابن

رجسٹرڈ

مالٹاسوپ

ڈالر سوپ

برائٹ سوپ

ہمیشہ استعمال کیجئے

جن کی کوالٹی اور معیار ایک سند ہے

تیار کردہ

اسلام آباد سوپ اینڈ کیمیکل انڈسٹریز لمیٹڈ (پرائیویٹ) پلاٹ نمبر 227 آئی نائن انڈسٹریل ایریا، اسلام آباد

415284-411080-411148

S. S. Ad.

آپ بھی مسکرائیے!

عنایت علی خان

سازِ الم نہ چھیڑیے نوحہ غم نہ گائیے
دل پہ نہ بوجھ لیجئے جان نہ یوں گھلائیے
شامِ الم گھنی سہی ایک دیا جلائیے
میری طرح سے دیکھیے گوشۂ لب ہلائیے
آپ بھی مسکرائیے!

میری تو کل متاعِ زیست ہیں یہی مسکراہٹیں
ان سے ملی ہیں راحتیں ان سے بھریں جراحتیں
ان سے سجی رہیں سزا فکر و نظر میں جنتیں
سحر تبسم اک ذرا آپ بھی آزمائیے
آپ بھی مسکرائیے!

تختۂ گل پہ دیکھئے رقص کناں ہیں تتلیاں
سبزہ نور سرہ سے جھانک رہی ہے کہکشاں
حسنِ ازل کے عکس سے نور فشاں ہے گلستاں
حسنِ ازل کے عکس میں حسنِ نظر ملائیے
آپ بھی مسکرائیے!

برق کی مسکراہٹیں پیرِ فلک کے قہقہے
شاخِ شجر سے پھوٹتے کیف طراز چہچہے
موج کی خوش خرامیاں آبِ رواں کے زمزمے
ان کے سرودِ شوق میں آپ بھی لے ملائیے
آپ بھی مسکرائیے!

مجھ سے رہی جو آپ کی درد کی رات کٹ نہ جائے
دل سے غمِ حیات کا سارا عناد چھٹ نہ جائے
حسرت و یاس کی بساط آپ سے آپ الٹ نہ جائے
پہلو کے زیست کو ذرا ہولے سے گدگدائیے
آپ بھی مسکرائیے!

دردِ فراق کی کسک شوق کی نارسائیاں
چشمِ عدد کی چشمگیں دوست کی بے وفائیاں
جن سے وفا کی تھی امید ان کی بھی کج ادائیاں
برقیؔ تبسم ان پہ اک میری طرح گرائیے
آپ بھی مسکرائیے!

وہ جو نہ تھا وفا شناس اس نے سلوک کیا کیا
آپ نے اس سے کیا کہا اس نے جواب کیا دیا
غیر سے ہنس کے کیوں ملا آپ سے کیوں خفا ہوا
آخر اب سے فائدہ - چھوڑیے بھول جائیے
آپ بھی مسکرائیے!

شاعری کا شوق

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

لمبے دار باتیں بنانے، ریشم جیسا تخلص رکھنے، گدی کے بال بڑھانے، بریف کیس میں حد درجہ انقلابی اور رومانی نظمیں رکھنے، ہروقت مسرور کن مستی میں سرہلانا اور ترنم سے گنگنانے اور گانے کے انداز میں لٹک لٹک کر شعر سنانے سے اگر ہم شاعر بن جاتے تو آج سے بہت پہلے شاعر بن چکے ہوتے اور ہمارے شاگردوں کا ایک جم غفیر ہوتا۔ لوگ بے استادی کا طعنہ دیتے ہیں اس لئے استاد تلاش کرنا چاہا تو تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد ہی پتا چل گیا کہ ہر وہ شخص جس کے نام کے آگے تخلص کا دم چھلا لگا ہوا ہے وہ پہلے سے ہی استاد ہے اور اس کے چیلے بھی ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر یوں لگتا ہے کہ پگڑی اور مٹھائی کے علاوہ بھی ڈھیروں پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں جب کہیں ڈھنگ کے شاعر کی شکل نظر آتی ہے۔

ہم نے شاعروں کے بارے میں پڑھنا شروع کر دیا کہتے ہیں شاعری کے لئے پہلا مقبول قدم یہی ہے بلکہ بعض نقاد حضرات تو اسے شارٹ کٹ کہتے ہیں۔ اس تگ و دو میں ہماری دوڑ دھوپ کام بھی آئی۔ ہمیں بہت سے شاعر ملے جو عجیب و غریب بھی تھے اور انوکھے بھی۔ بڑی مشکل سے ایک تصویر پر یقین کرنا پڑا کہ یہ اپنے دور کے جید شاعر ثنا اللہ میراجی کی شبیہہ ہے قشقہ کھینچے، جٹو ڈالے معقول قسم کے پجاری لگ رہے تھے۔ ان کے اشعار پڑھے، سمجھ میں نہیں آئے کچھ عجیب سے لگے۔ صبر کیا۔ عجیب چیزیں محض عجیب اور انوکھی ہونے کی وجہ سے جلد مقبول ہو جاتی ہیں۔ غالب کی شاعری کو بھی ان کے دور کے نقاد اور سامعین مجذوب کی بڑ کہنے کے بعد انوکھی شاعری سمجھتے تھے۔ ممکن ہے یہ شارٹ کٹ ہو لیکن میراجی کا سا حلیہ بنانا اور ان کی سی حرکتیں کرنا اچھا خاصا میک اپ اور کلاسیکل اداکاری کے مترادف تھا۔ پھر بعد میں کسی نے یہ ہوائی بھی اڑائی کہ اس اداکاری کے ساتھ وہ سچ مچ کی ٹھرے کے ساتھ ڈرائی جن بھی پی لیتے تھے۔ جب رات گئے اپنی کھولی میں واپس آتے تھے تو انہیں دروازہ نہیں ملتا تھا۔ شاید وہ تلاش کرنے کی زحمت بھی نہیں کرتے تھے سڑکوں کی فٹ پاتھ کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے خواب استراحت فرماتے تھے۔ اگر اس قسم کی ہم کبھی کوشش بھی کرتے تو کہیں نہ کہیں ملاوٹ میں پکڑے جاتے اس لئے توبہ تلا پر ہی گزر اوقات کی۔ آپ بھی سوچئے اس طرح شاعر بننا کتنا مہنگا سودا پڑتا۔ اخلاقیات کی تو ہمیں اتنی زیادہ پروا نہیں تھی وہ تو یہ کہئے کہ ہم میں ایسے گھس ہی نہیں تھے۔

ہم نے پہلے تو انقلابی اور وہ بھی خطرناک قسم کی انقلابی شاعری کے نتائج پر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ غور کیا۔ پھر اس کی تفصیل پڑھی۔ گھن، گرج، توڑ پھوڑ، گھراؤ جلاؤ والی جوش کی شاعری کی ایک دو نہیں پوری ایک درجن کتابیں توجہ کے ساتھ پڑھیں۔ ہم بقول دوسروں کے باریک سے باریک اور نازک سے نازک بات آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اس پوری شاعری میں سمجھ میں نہیں آیا انقلاب پسندی کی حدود کیا ہیں۔ انقلابیت کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہو جاتی ہے اس کے علاوہ وہ یہ کہ یہ انقلابیت ہم میں کس طرح حلول ہو سکتی ہے۔ ادھر ادھر کی سنی سنائی باتوں سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ انقلابی شاعر بننے کے لوازمات کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔

لیجئے اصل بات سے ہی ہٹا جا رہا ہوں اصل مسئلہ تو شاعر بننے اور شاعری کرنے کا تھا شاعر بننے کے لئے یہ بھی تو ضروری ہے کہ شاعر اپنا مخصوص اسٹائل رکھتا ہو۔ ہم میں نہ تو میر کی سی خوبیاں تھیں نہ خامیاں۔ غمگین ہونے، موڈ آف کرنے یا ہونے اور رونے کی وہ بھی مسلسل رونے کی کوئی خوبی ہم میں پیدا ہی نہیں ہو سکی۔ بھلا سوچئے ہم اتنا کس طرح رو سکتے ہیں کہ سیلاب آجائے۔ ڈوبنے کا بھی خطرہ۔ حکومت کے لئے بھی پریشانی۔ محلے اور شہر کے لوگ بھی تنگ۔ روتے روتے تنگ جو سوئے تو کوئی ہمیں اٹھانے والا بھی نہ ہوگا لوگ سوچیں گے چلو اچھا ہی ہوا چھٹی ہوئی خس کم جہاں پاک۔ ہم نہیں چاہتے ہمیں اس بری طرح چاہا جائے۔ ہم اپنی عادتیں سب پر ظاہر نہیں کر سکتے۔ غالب کی طرح نہ تو ہم کسی ڈومنی کو مار رکھنے کا

ارادہ رکھتے ہیں۔ نہ میر کی طرح کسی عطار کے لونڈے کو جانتے ہیں۔ نہ جوش کے انداز میں میرے جوبنا کا دیکھو ابھار کے معیار پر پورے اتر سکتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں آ ہی نہ تھا کہ اسٹائل کس طرح بنائیں اپنے نام کے ساتھ کس قسم کا تخلص ٹانکیں' کس طرح ہم جھوم جھوم کر چلیں' گنگنائیں' بات بات پر مسکرانے کی کوشش کریں' انجان بن کر معصومانہ انداز اختیار کریں۔ اپنی شاعری کا اس طرح رنگ جمائیں کہ سامعین اور مشاعرے باز ہمیں ٹوکروں کے حساب سے داد دیں اور خوشیوں کے انبار لگائیں۔

نثری نظم کے بارے میں یار لوگوں نے بہت سی افواہیں اڑا رکھی تھیں۔ ہم افواہوں پر کان دھرنے والے تو نہیں ہیں پھر بھی نثری نظم کی تن آسانی نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ لوگوں نے کبھی یوں بھی گل افشانی کی کہ یہ وہ شاعری ہے جس کا کبھی کسی کو کوئی سرا نہیں مل سکتا۔ کس طرح شروع کی جائے کس طرح ختم کی جائے اس میں یہ مسئلہ ہی نہیں اٹھتا۔ پڑھنا تو مشکل کام تھا لیکن دل پر جبر کر کے شروع کیا۔ ہم نے میر' غالب' جوش اور فیض کو یا پھر ن ۔ م ۔ راشد اور میرا جی کو پڑھا تھا اس لئے یہ بے وزن شاعری انوکھی اور عجیب لگی۔

قمر جمیل بھیڑے کے منہ میں چاند لئے جا رہے ہیں۔ شاعری کی پتلون کی جیب میں اس کا بچپن سو رہا ہے اس کے بعد کیا ہوا کل کے اخبار میں پڑھیئے لکھا ہوتا تو صبر آجاتا وہاں تو میدان ہی صاف ہے۔ ہم نے اس قسم کی مادر پدر آزاد شاعری کو آسان ترین نسخہ سمجھا تھا۔ سوچا تھا اگر ہم ہزیان بکیں گے تو یہ مسئلہ ہمارا نہیں ہوگا جو کتاب خرید کر پڑھے گا اس کا ہوگا۔ ایک دن ہم نے جو فکر کی (فکر تو میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ شاعری کی توقیر باقی رہے) تو معلوم ہوا ایک سو اڑتالیس نظمیں تیار ہو گئیں۔ ایک سو اڑتالیس تو ہم نے صفحات کے حوالے سے شمار کیں تھیں اشعار (اگر کوئی انہیں اشعار ماننے کے لئے تیار ہو تو) خود ہماری سمجھ میں بھی نہیں آئے۔ دو چار دوستوں کو دکھائے وہ ہمیں کاٹنے کو دوڑے۔ ہمیں اس لئے بلایا ہے؟ وہ پہلے تو ہماری شکل دیکھ کر روئے پھر ہنسے ہم نے پوچھا یار ماجرا کیا ہے۔ ایک بے باک دوست نے گل افشانی کی ہم سمجھے ہیں کہ آپ گھاس کھا گئے ہیں یا پھر آپ حال ہی میں گدو سے تشریف لا رہے ہیں۔ دو ایک رسالے والوں کو دکھائے سنا پوری چائے کے کئی کپ پلائے۔ وہ بھونچکے رہ گئے پوچھنے لگے طبیعت تو آپ کی ٹھیک ہے۔ یہ ہے کیا چیز؟ اب ہم انہیں یقین دلا رہے ہیں اور ان کا شبہ ہماری دماغی کیفیت کے بارے میں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ جھگڑے والی بات بھی ہو سکتی تھی۔

شاعر کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہوتی ہیں یہ بات ہم وثوق سے نہ پہلے کہہ سکتے تھے نہ اب کہہ سکتے ہیں۔ باوجود کوشش کے ہم سراغ نہیں لگا سکے۔ ایک دفعہ قمر جمیل صاحب جبکہ وہ موڈ میں تھے بتایا کہ وہ نثری نظم کے بانی ہیں۔ ادب میں تھوڑی سی شدھ بدھ ہمیں بھی ہے ہم نے برملا کہا بھائی کیا غضب کرتے ہو لوگوں کے قہر کو کیوں دعوت دیتے ہو۔ شاعر بپھر جائیں گے وہ طوفان اٹھائیں گے کہ کرفیو وغیرہ کی ضرورت پڑ جائے یہ امن و امان کا مسئلہ بن جائے گا تم سے پہلے بھی اور لوگوں نے اس قسم کے دعوے کئے تھے اس کی مثالیں گو سند نہیں رکھتیں ہاں یہ ضرور ہے کہ آج تک سینہ بہ سینہ چلی آتی ہیں۔ پنجاب میں انیس ناگی نام کے ایک صاحب نے دعویٰ کر ڈالا ہے انہوں نے تو نثری نظم پر ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے اس کے علاوہ بھی کئی چھوٹے چھوٹے سنسنی خیز مضمون بھی لکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نثری نظم کا معیار دراصل وہ ہے جو انہوں نے مقرر کر دیا ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ ان کا قائم کردہ معیار خود ان کے لئے چیستان بن کر رہ گیا ہے کشور ناہید کی نثری نظمیں انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ ممکن ہے فتنہ پسند لوگ یہ چاہتے ہوں کہ قمر جمیل کو غصہ دلایا جائے۔ قمر جمیل بھاری بھر کم آدمی ہیں وہ اگر جھوٹ موٹ کو گھونسہ بھی دکھا دیں تو بات رفع دفع ہو جائے لیکن ہم درویشوں کی کون سنتا ہے۔

کوئی مانے یا نہ مانے نثری نظم ہے بڑے کام کی چیز۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ یہ کس نے ایجاد کی یا گھڑی لیکن ہم جیسے تن آسان کے لئے نیک فال ضرور ہے۔ اب دیکھو نا کسی بچے نے بلی کو مارا اس کی دم آرٹسٹ کے رنگوں میں لتھڑ کر سامنے لگے ہوئے صاف ستھرے کینوس پر جا لگی اور نقش و نگار بن گئے۔ بچاری بلی کو کیا خبر تھی کہ اگر اس کا نام انسانوں جیسا ہوگا تو تجریدی آرٹ کے خصوصی حوالے سے سنہرے لفظوں میں لکھا جائے گا بے شمار تشریحات ہوں گی۔ نثری نظم بھی تجریدی آرٹ کی جڑواں بہن ہے۔ یہ ہم کیا لے بیٹھے' بھائی ہم بات کر رہے تھے اپنے شاعروں کے بارے میں اور شاعری کے بارے میں اپنی خصوصی دلچسپی کی۔ یہ بات دوسری ہے کہ نثری نظم میں ابلاغ نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی یہی تو اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ بات کس کی ہو رہی ہے تاثر کہیں اور ہے۔ لفظوں کے معنی وہ ہرگز ہرگز نہیں ہیں جو لغت میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ مارو گھٹنہ پھوٹے آنکھ والی بات ہے ادھر ڈوبے ادھر نکلے' ادھر ڈوبے ادھر نکلے۔ دو تین سطریں آپ بھی سنئے یہ نظم قمر جمیل کے نام عبدالرشید نے لکھی ہے۔

تمہارے کمرے میں دو کبوتر ہیں۔

ایک سفید اور ایک سیاہ
اسی طرح تمہارے دل میں بھی دو کبوتر ہیں
اور کرسی پر بیٹھے ہوئے تم خود ایک بوڑھے کبوتر ہو۔
ایک اور نظم عبدالرشید ہی کی ملاحظہ ہو۔

دکھ انسان کو بھگو دیتا ہے اور اس پر پڑنے والی ضرب اس کی روح تک نہیں پہنچتی۔ ایسی دھوپ کی طرح جو کول تار کی سڑک پر برس کر اسے پگھلا دیتی ہے' لیکن مٹی کی طینت اور اس کے خمیر کے دروازے نہیں کھول سکتی ——————

ہماری بات مذاق میں نہ ٹالیے ہم تو سچی سچی دل کی بات کہہ رہے ہیں۔ ہمارے لئے تو پابند شاعری ہی الجھن کا سبب بن رہی تھی۔ بھلا یہ حد درجے کی بے قاعدگی کس طرح برداشت ہو سکے گی اس شاعری میں تو نہ سودا کا سا دبدبہ ہے' نہ انیس کی سلاست' نہ مصحفی کی سادگی' نہ غالب کا فلسفہ' نہ جوش کی سی گھن گرج' نہ فیض کی سی دلآویزی' نہ جگر کی سی گہرائی' نہ اصغر کا سا تصوف' نہ فانی کی سی بے ثباتی کا فلسفہ' غرض ہم سیدھے سادے انسان یہ انوکھی شاعری ہماری سمجھ میں آتی ہی نہیں۔

ہمارا تجربہ کہتا ہے جس کے بال الجھے ہوئے ہیں' جو قلم اٹھا کر اور کاغذ سامنے رکھ کر فلسفیانہ انداز سے سوچتا ہے تو سوچتا ہی چلا جاتا ہے۔ جس کا جلا ہوا سگریٹ کش لینے سے پہلے ہی فاکستر ہو جائے' جب کسی نوعمر خاتون سے بات کرے تو بات بات پر شرمائے اور جب بات کرنے پر آئے تو بے مقصد باتیں بھی گھنٹوں کے حساب سے کر سکے۔ کام کاج سے جی چرائے' ہر دس منٹ کے بعد سنگاپوری چائے پینے کے لئے آمادہ رہے چین اسموکر ہو' وہ اگر شاعری نہیں بھی کرتا تو بھی لوگ اسے شاعر سمجھ لیتے ہیں اور اس کی ہر ادا پر دل کھول کر داد دیتے ہیں۔

ہم میں کوئی شرعی عیب نہیں ہے پھر شاعر بننے کا شوق کیوں اس شدت کے ساتھ عود کر آ رہا ہے۔

صدیق سالک

کو نذرانہ عقیدت

خوبصورت باتیں حسین یادیں

اور

نئے انکشافات

آخری سلیوٹ

مرتبہ

بشریٰ رحمن

سید ضمیر جعفری

قیمت مجلد -/150

ملنے کا پتہ

وطن دوست پرائیویٹ لمیٹڈ

8 سی احمد پارک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

فکر کی طرحداری اور حرف کی پاسداری کے شاعر

محسن احسان کا تیسرا مجموعہ کلام

ناشنیدہ چھپ گیا ہے

پبلشرز۔ الحمد پبلی کیشنز' ایبک روڈ پرانی انارکلی لاہور

بزم بتاں میں سخن آزردہ

انوار شریف

اس نیوز ریڈر خاتون کا لطیفہ آپ نے ضرور سنا ہوگا جو خبریں پڑھنے کے دوران ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظر آتی تھیں۔ پروڈیوسر نے خاتون کو سنجیدگی سے منع کرنے کے ساتھ پیراگراف مکمل ہونے پر تھوڑا سا مسکرانے کی ہدایت بھی کی خاتون سمجھدار تھیں حرف بہ حرف پروڈیوسر کی ہدایت پر عمل شروع کر دیا حتیٰ کہ ایک دن کسی نامور ہستی کی موت کی خبر سنا کر بھی مسکرانا نہ بھولیں۔

آج کل کے گلوکاروں میل فی میل کا طرز عمل بھی خاتون مذکور جیسا ہے بقول جگر مراد آبادی

ہر حقیقت کو بہ اندازِ تماشا دیکھا
خوب دیکھا تیرے جلووں کو مگر کیا دیکھا

عشقیہ طربیہ' المیہ کسی بھی قسم کا گانا گائیں زور گانے سے زیادہ مسکرانے پر ہوتا ہے۔ بیشتر گانے والے اور والیاں گانے سے زیادہ مسکرانے کی ریاضت میں وقت صرف کرتے ہیں مسکرانے کا یہ باجماعت عمل ایک رد عمل کی نتیجہ میں عام ہوا ہے۔

انیس سو پینسٹھ کی جنگ میں دلوں کو گرمانے والے جنگی ترانوں سے شہرت حاصل کرنے کے بعد مہدی حسن صاحب نے غزل گائیکی میں اپنا لوہا منوانا شروع کیا۔ تو بہت سے بڑ بولے قسم کے ناقدین و شائقین موسیقی کو مہدی حسن صاحب کی اس حد تک مقبولیت ناگوار گزری کہ کسی محفل میں کوئی صاحب فیض صاحب سے فرمائش کر بیٹھے کہ مہدی حسن کی غزل سنائیے۔

مہدی حسن صاحب کا تعلق گائیکی کے معزز گھرانے سے ہے۔ مگر ابتدا مہدی حسن صاحب نے محنت کشی سے کی مٹی کھودنے بائیسکل مرمت کرنے موٹر مکینکی ورزش پہلوانی خوش خوراکی کے علاوہ بہت سے پاپڑ بیلنے کے بعد موسیقی کے کوچہ میں مستقل گوشہ نشین ہوئے۔

جو لوگ فنی طور پر مہدی حسن صاحب کی گائیکی میں کوئی نقص نہ نکال سکے وہ ان کے چہرے کو تنقید کا نشانہ بنانے لگے۔ مہدی حسن صاحب الفاظ کی صحت کے ساتھ مفہوم کی ادائیگی کے بھی قائل ہیں۔ اس دوہرے تاثر کی ادائیگی میں چہرے کی ہیبت تھوڑی بہت تبدیل ہو جاتی ہے۔ مہدی حسن صاحب کے نابالغ ناقدین نے ان کی اس بے ضرر خامی کو اتنا اچھالا کہ مہدی صاحب تو اس سے تائب ہو ہی گئے نئے آنے

والے گلو کار اس تنقید سے اتنے خائف ہوئے کہ گانے کے بجائے گالوں پر زیادہ توجہ دینے لگے یہاں ہمیں حضرت داغ کا ایک شعر یاد آیا۔

اس واسطے دیتے ہیں وہ ہر روز نیا داغ
اک درد کے خو گر نہ ہو بیمارِ محبت

اس الزام کی گرد مہدی حسن صاحب نے اپنے طرز عمل سے بیٹھا دی تو یار لوگوں نے خان صاحب سے یہ بیان منسوب کر دیا کہ وہ گانے کے زور پر شیشہ کا گلاس توڑ سکتے ہیں ہمیں نہیں معلوم مہدی صاحب نے یہ بیان کب اور کہاں دیا۔ البتہ اس خود ساختہ بیان کی آڑ میں کچھ لوگوں نے خوب خوب دل کے ارمان پورے کئے اور جی کھول کر مہدی حسن صاحب کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

جب آپ یہ کہتے نہیں تھکتے کہ موسیقی روح کی غذا ہے تو غور فرمایئے اس کی تاثیر پر اس کے اندر پوشیدہ اُس قوت پر جو بے شمار دنیاوی کیفیتوں کو چند ساعتوں میں رفو کر کے انسان کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اس قوت سے محیرا لعقول نتائج حاصل کرنا ناممکنات میں سے نہیں کار دشوار ضرور ہے۔ اس میں جس ریاضت محنت لگن اور نفس کشی کی ضرورت ہے وہ ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔

گلاس توڑنے بارش برسانے اور مریض کو صحتیاب کرنے کیلئے جس فضا ماحول حدّت و شدت کی ضرورت ہوتی ہے وہ آپ موسیقی کے علاوہ دیگر عوامل سے بھی پیدا کر سکتے ہیں سب سے اول عبادت و ریاضت ہے اپنے استدلال کی صداقت میں جناب قاری وحید ظفر اور محترمہ ام حبیبہ کی مثال دینا چاہوں گا دنیا کے کسی بھی حصے سے کسی بھی مذہب کے پیروکار کو لے آیئے اگر وہ قاری صاحب اور ام حبیبہ کی نعت خوانی سے بے بس نہ ہو جائے تو میں اپنا استدلال از خود واپس لے کر ہر سزا کا مستحب بن جاؤں گا۔۔۔ اپنوں کی کوتاہ نظری آپ نے ملاحظہ فرمائی بقول مومن

سجدہ نہ کہیں کرتا مومن قدمِ بت پر
کعبے ہی میں ہوتی ہے بیہودہ سری اتنی

جب ہم برصغیر کے اس منفرد غزل گو کو اپنے تیر و تفنگ کا نشانہ بنا رہے تھے عین اسی دوران برصغیر کی موسیقی کو نئی زندگی بخشنے والی عظیم گلو کارہ لتا منگیشکر نے ہر قسم کے تعصب سے بلند ہو کر خان صاحب کو ان الفاظ میں خراج تحسین پہنچایا مہدی حسن صاحب کے گلے میں سر کی جگہ

بھگوان بولتے ہیں اور میں اپنی ہر صبح کا آغاز انہی کی آواز سے کرتی ہوں۔ یہ خراج تحسین موسیقی کا کوئی شائق دلدادہ یا طالب علم پیش کرتا تو بھی لائق احترام تصور کیا جاتا چہ جائیکہ یہ سند پسندیدگی اس ہستی نے عطا کی جس کے فن کی گونج دنیا کے ہر اس کونے میں گونج رہی ہے جہاں جہاں سینوں میں دل دھڑک رہے ہیں۔۔۔ عرصہ پچاس سال سے موسیقی کو جو بن بخشنے والی لتا منگیشکر ہمارے مہدی حسن صاحب کی اس قدر معترف فن اور گرویدہ ہو اور ہم ان کی فنی عظمت کو پس پشت ڈال کر ان کو فروعی مسائل میں الجھائے رکھیں۔۔۔ کیا کہوں۔۔۔ کیا عرض کروں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

ان گنت بلاؤوں اور لا تعداد فرمائشوں کے پیش نظر مہدی حسن صاحب بھارت کے شہر بمبئی تشریف لے گئے تو ان کا استقبال دیکھنے والوں پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی بھارتی فلم انڈسٹری کے تمام اہم ستون اک قطار میں اس طرح سانس روکے کھڑے تھے جس طرح وزرا سفرا غیر ملکی سربراہان حکومت کی تعظیم میں کھڑے ہوتے ہیں۔ خان

صاحب مہدی حسن کسی ملک کے نہ سہی غزل گائیکی کے بے تاج بادشاہ ضرور ہیں۔ اس وقت کی استقبالیہ قطار میں لتا منگیشکر، محمد رفیع، آشا بھونسلے، مکیش، طلعت محمود، شمشاد بیگم، منا ڈے، دلیپ کمار، راج کپور، دیو آنند، راج کمار، سنیل دت، دھرمیندر، منوج کمار، وحیدہ رحمن، آشا پاریکھ، اوم پرکاش، اور پران کے علاوہ مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ بھی موجود تھے قیام بھارت کے دوران حکومت ہند نے مہدی حسن صاحب کو وہی پروٹوکول دیا جو غیر ملکی سرکاری مہمانوں کو دیا جاتا ہے۔ جہاں جہاں مہدی حسن صاحب جاتے وزیر اعلیٰ خود یا وزیر کے درجے کا کوئی نہ کوئی اہم سرکاری اہل کار ان کی پذیرائی کے لئے موجود ہوتا۔

مہدی حسن صاحب کا آبائی تعلق راجستھان سے ہے جب وہ اپنے آبائی گاؤں گئے تو سڑک کچی اور آبائی قبرستان کی حالت ناگفتہ بہ تھی جسے دیکھ کر مہدی حسن صاحب سے خاموش نہ رہا گیا صوبے کے وزیر اعلیٰ سے اس کا گلہ کر بیٹھے------ یقین کیجئے مہدی حسن صاحب کے قیام بھارت کے دوران ہی سڑک اور قبرستان کی دیوار کی تعمیر مکمل ہو چکی تھی۔

اس سفر کے دوران خان صاحب بھارت کے ایک اور شہر گئے جہاں جہاں ان کے قدم پڑتے وہاں وہاں سے ایک انتہائی مہذب نوجوان مٹی بٹورنا شروع کر دیتا مصروفیت کے باعث مہدی حسن صاحب نوجوان کی حرکت پر غور نہ کر سکے ایک اخبار نویس کے استفسار پر نوجوان نے مٹی بٹور کر شیشے کی بوتل میں بھرنے کا سبب یہ بتایا کہ اس کی والدہ خان صاحب کی اس درجہ پرستار ہیں کہ وہ اس مٹی کی پوجا کرتی ہیں---- بات عقائد کی نہیں عقیدت کی ہے محبت کی ہے جاں نثاری اور جاں شپاری کی ہے۔

کیا یہ چند نمونے ہمیں مہدی حسن صاحب کی طرف تحسین بھری نظروں سے دیکھنے پر مجبور نہیں کرتے کیا اس کے بعد بھی ہمارا سر فخر سے بلند نہیں ہوتا جس سرزمین سے ہمیں نفرت اور تکذیب کے علاوہ کبھی کچھ نہ ملا اس سرزمین پر مہدی حسن صاحب اپنے فن کی بدولت محبت کی ایسی فصل بو رہے ہیں جو مقدار میں ذرا کم تاثیر میں بہت زیادہ ہے------ بنیادی طور پر وعظ و نصیحت زیادہ پسند نہ کرنے کے باوجود آپ سے گزارش کروں گا فنکار کھلاڑی تکنیک کار پیشہ ور ماہر غرض جو بھی قومی ہیرو ہے جس نے بھی ملک کی عزت کو نمایاں کرنے میں حصہ لیا ہے اس کو ہمیشہ اس کے شعبے کی مناسبت سے جانچیں یا پرکھیں یہ آپ کا حق ہے اگر ہم عالم دین کو سائنسی اوزان میں تولیں سائنسدان کو مذہبی کسوٹی پر پرکھیں کھلاڑی میں ڈاکٹر کی مسیحائی یا ڈاکٹر میں کھلاڑی کی پھرت تلاش کرنا شروع کر دیں صوفی سے رند اور رند سے صوفی کے کردار کی توقع کریں تو یہ بے جا سوچ ہے اس سے تعصب اور تنگ نظری کی بو بھی آتی ہے ہمیں مہدی حسن صاحب کو اخلاق کا بادشاہ بنانے کی کوشش ترک کر کے غزل کا بادشاہ ہی رہنے دینا چاہیے -------- اسی میں ہماری اور مہدی حسن صاحب کی بہتری پوشیدہ ہے

موقع غنیمت جان کر خان صاحب سے بھی عرض کروں گا۔ جناب، گانے والے کو پہلا سبق یہ دیا جاتا ہے کہ سامعین کو گونگا بہرا سمجھو اور اپنا کام جاری رکھو------ گونگے اور بہرے سامعین کے علاوہ آپ کے سامنے تو ماشا اللہ داتا اور بینا عبدالستار ایدھی، انصار برنی اور عمران خان کی قابل رشک مثالیں موجود ہیں آیئے اور لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں ڈٹ جایئے بقول اقبال

اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

جدید و قدیم فارسی ادب کے مختلف پہلوؤں پر معروف شاعر اور استاد انور مسعود کے خیال انگیز مقالات کا مجموعہ

"فارسی ادب کے چند گوشے"

جن کو مصنف کی خوش مزاجی، خوش نظری اور خوش فکری نے حد درجہ قابل مطالعہ بنا دیا ہے

دیدہ زیب طباعت اور خوبصورت گیٹ آپ۔ قیمت 100 روپے

ملنے کا پتہ

عاقب پبلشرز 403 آئی ٹاؤن ون اسلام آباد

ملاقات

ادارے اور شعبے اپنے کارکنوں کی پہچان کا سبب بنتے ہیں ـــــ کچھ لوگ کام سے سچی لگن کے باعث اپنے شعبے کی شناخت بن جاتے ہیں ـــــ ارجمند شاہین ایسی ہی باوضع اور پروقار خاتون کا نام ہے جنہوں نے خبریں پڑھنے کے پیشے کو معتبری کے اس مقام تک پہنچایا کہ ان کا نام خبر کی علامت بن گیا ذیل کی گفتگو سے ارجمند شاہین کی شخصیت اور فن کے نئے گوشے نمایاں ہوں گے۔

عطیہ افروز

* خبر سے آپ کا رشتہ کب اور کیونکر قائم ہوا؟

* میرے گھر اور میرے بچوں کے اسکول کے راستے میں براڈ کاسٹنگ ہاؤس پڑتا تھا۔ روزانہ صبح اسکول چھوڑ کر آنے اور واپس لانے کے دوران سامنے سے گزرتی تو نیوز ریڈرز کو آتا جاتا دیکھتی۔ بس اچانک ایک دن دل میں خیال آیا کہ میں بھی ان میں سے ایک کہلاؤں۔ میں نے 1974ء میں آڈیشن دے ڈالا اور خبریں پڑھنے لگی۔ لیکن خبریں پڑھنے کی تربیت مجھے جی ۔ایم ۔ آر صاحب نے دی۔ جو سلمیٰ بیگ کے والد محترم تھے۔

* نیوز ریڈر کے لئے کس قسم کی قابلیت ضروری ہے؟

* تعلیمی قابلیت کے علاوہ چند بنیادی باتوں میں ضروری ہے کہ اس کی آواز صاف ہو۔ جو الفاظ ادا کرے سننے والے کو سمجھ میں آئیں۔ یعنی ادائیگی۔ تلفظ کا صحیح ہونا۔ لہجہ شائستہ ہو۔ پر اثر ہو۔ حالات حاضرہ سے باخبر ہونا۔ اور حاضر دماغی اضافی خصوصیات ہیں۔ ٹی وی کے لئے متاثر کن شخصیت کی اہمیت سے ہی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے پہلے تو شخصیت سامنے آتی ہے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

* خبریں پڑھنا پرفارمنگ آرٹ کے زمرے میں آتا ہے؟

* محض سپاٹ لہجے میں خبریں پڑھ دینا تو کوئی کمال نہیں۔ الفاظ کا زیر و بم لہجے کا اتار چڑھاؤ جملے کی ادائیگی سے نیوز ریڈر کا ناظر سے رابطہ اور رابطے کا تسلسل چہرے کے تاثرات اشارے کنایوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ جو بات وہ کر رہا ہوتا ہے وہ مخاطب تک پہنچی چاہیئے۔ یہ سب باتیں اور کسی نیوز ریڈر کا منفرد انداز یہ سب میرے خیال سے تو پرفارمنگ آرٹ کے زمرے میں آتی ہیں۔

* ٹیلی ویژن پر خبریں پڑھنے کے دوران مسکرانا کب سے رائج ہوا؟

* شروع میں ٹی وی پر خبریں پڑھتے ہوئے کبھی اڑانے کی بھی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ نیوز ریڈر انتہائی دباؤ کا شکار رہتا تھا۔ آہستہ آہستہ انداز میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اور باقاعدہ ہمیں یہ ہدایت تحریری طور پر ملی کہ مسکرایا کریں۔ مسکرانے کے بھی کچھ آداب ہیں۔ موقع محل پر تو ٹھیک ہے لیکن خبریں اتنا سنجیدہ موضوع ہیں ساری دنیا میں بھوک جنگ۔ خون خرابہ ہو رہا ہو اور ہم مسکرا رہے ہوں تو دیکھنے والوں پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ کوئی مضحکہ خیز صورت حال ہو یا واقعی مسکرانا ضروری ہو گیا ہو تو اچھا بھی لگتا ہے۔ لیکن خبروں کے دوران بغیر کسی وجہ کے مسکرانا اور پھر مسکراہٹ بھی تو کئی قسم کی ہوتی ہے ---------- سچ پوچھئے تو میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ دوران خبرنامہ میں بے حجابانہ مسکراؤں' اٹھلاؤں -----

مجھے پتہ ہے میرا باپ بھی ٹی وی دیکھتا ہے۔ اور آپ یقین کریں محض اس بات پر کہ میں مسکراتی کیوں نہیں بارہا میری باز پرس کی گئی۔

* نیوز کا شعبہ شو بزنس کا حصہ کب سے بنا؟

* یوں تو ٹی وی پر خبرنامہ شروع ہونے کے ساتھ ہی اس کی ابتداء ہو گئی تھی۔ جس طرح اور شعبوں میں فنکارانہ صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے نیوز کی ادائیگی میں بھی فنکارانہ مہارت ضروری ہے۔ اور لوگوں (ناظرین) کی پسند ناپسند نے بھی نیوز ریڈر کی شخصیت کو شو بزنس کا حصہ بنا دیا۔ لیکن اس کا باقاعدہ اعتراف اس وقت ہوا جب ضیاء الحق صاحب نے غالباً 76 میں ٹی وی کے فنکاروں کو ملاقات کی دعوت دی جن میں نیوز ریڈرز بھی شامل تھے۔ اور اس وقت کی نیشنل اسمبلی ہال میں یہ اجتماع ہوا تھا۔

* پی ٹی وی سے آپ کی علیحدگی کے اسباب کیا ہیں؟

* ستارہ زیدی بھی جب جاپان چلی گئیں تو ٹی وی پر تنہا ثریا شہاب رہ گئیں جو ریڈیو پر بھی خبریں پڑھتی تھیں۔ اور فوراً خبرنامہ کے لئے ٹی وی پہنچتی تھیں۔ نیوز کے آڈیشن ہوئے تو مجھے ٹی وی سے کنٹرولر ضیاء الدین بٹ صاحب نے فون کر کے آڈیشن دینے کو کہا۔ ریڈیو پر تو میں خبریں پڑھ رہی تھی۔ میری بہن یاسمین واسطی لاہور ٹی وی سے پڑھتی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ میں یاسمین جیسی نہ سہی اس سے ملتی جلتی تو ہوں گی۔ لہٰذا 1976ء سے میں نے خبرنامہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس وقت خبرنامہ وہی پڑھ سکتا تھا جس کو A گریڈ مل گیا ہو۔ مجھے فوراً ہی اے گریڈ مل گیا اور 83 میں پی ٹی وی ایوارڈ بھی شروع میں تو میرٹ ہی کی اہمیت تھی لیکن بعد میں بدقسمتی سے پرچی نے یہ امتیاز بھی مٹا دیا۔ اور صلاحیت سے عاری اور نو آموز لوگوں کو فوقیت دی جانے لگی۔ خوشامد کے برعکس میرا استدلال کام نہ آیا تو میں نے ٹی وی نیوز کو خیرباد کہہ دیا۔

* آپ اس تاثر سے اتفاق کرتی ہیں کہ پی ٹی وی بڑھتی ہوئی عمر کی اناؤنسرز اور نیوز ریڈر سے الرجک ہے؟

* اگر ایسا ہوتا اظہر لودھی صاحب اب تک خبریں کیوں پڑھ رہے ہوتے؟ لیکن میں نے نیوز پڑھنا اس وقت چھوڑ دی تھیں جب وہ میرے عروج کا زمانہ تھا۔ میں نے 1985ء کو خبریں پڑھنا چھوڑ دی تھیں اس کے بعد 90 کے آخری 4 ماہ میں نے اس وقت کے ڈائریکٹر نیوز سے تعاون کرتے ہوئے خبریں پڑھیں کیونکہ اس وقت ٹی وی پر نیوز ریڈرز کا سخت بحران تھا۔ ثریا شہاب، ماہ پارہ صفدر اور خالد حمید بیرون ملک چلے گئے تھے۔ لیکن ہوا کیا کہ care Taker گورنمنٹ کے آتے ہی وہ لوگ پھر سے بحال ہو گئے جن سے میرا اصولی اختلاف تھا۔ انہوں نے آتے ہی میری چھٹی کرا دی۔ اور یوں اپنا بدلہ لے لیا۔

* پی ٹی وی سے ملنے والے معاوضے میں خواتین نیوز ریڈر کا لباس خرچ نکل آتا ہے کیا؟

* پی ٹی وی پر ملنے والا معاوضہ واقعی بہت قلیل ہے۔ میری تجویز ہے کہ نیوز ریڈرز کو Maintanance Allounce دیا جانا چاہئے۔

* کہانیاں کب سے لکھ رہی ہیں آپ؟

* سکول کے زمانے میں ایک کہانی لکھی تھی اور وہ مقامی رسالے میں جو نیا نیا مارکیٹ میں آیا تھا چھپی بھی تھی۔ اور تعریفی خط بھی ملا تھا۔ لیکن بعد میں وہ رسالہ جاری نہ رہ سکا اور میں بھی شادی کے بعد بیرون ملک چلی گئی۔ واپس آکر 1970ء میں میں نے "تخلیق لاہور میں" "دیس بدیس" کے عنوان کے تحت مختصر سا سفر نامہ لکھا تھا۔ پھر طویل وقفے کے بعد 1987ء میں میری ایک کہانی ڈیلی جنگ راولپنڈی کے ادبی صفحے پر چھپی۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا ہنوز جاری ہے۔

* مستقبل میں اپنی شناخت کس حوالے سے کرانا پسند کریں گی آپ؟

* میری شناخت کے بہت سے حوالے ہیں۔ تعلیم کے دوران میں سنگر ڈبیٹر اور ڈرامہ آرٹسٹ کے طور پر پہچانی جاتی تھی۔ میرا رجحان بچپن سے مصوری کی طرف تھا۔ Life Drawing میرا پسندیدہ مضمون تھا۔ اگر میں اپنی تعلیم مکمل کر لیتی تو آج ایک آرٹسٹ کے طور پر پہچانی جاتی۔ لیکن دوران تعلیم میں شادی ہو جانے نے کام بگاڑ دیا۔ میری پہچان اب نیوز ریڈرز کی حیثیت سے ہے اور آئندہ بھی یہی رہے گی باقی چیزیں ثانوی ہیں۔ میں نے بہت بعد میں ماس میڈیا میں بی۔ اے کیا۔

* ریڈیو ٹیلی ویژن کے حوالے سے ان دشواریوں کا ذکر کیجئے جو ان اداروں سے وابستہ خواتین کو پیش آتی ہیں؟

* کبھی میرٹ ہی آرٹسٹ کی کامیابی کی دلیل ہوا کرتا تھا۔ لیکن جہاں زندگی میں اور بہت سی خامیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ معیار بھی بدل گئے ہیں۔ اخلاقیات زوال پذیر ہیں۔ بعد میں آنے والا اگلے کو دھکا دے کر آگے نکل جانے کی دوڑ میں لگا ہوا ہے چاہے اس کے لئے کچھ بھی کرنا پڑے ریڈیو ٹی وی پر بھی حالات بدل گئے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کام کرنے والی خواتین کی مخالفت بہت شدید ہے اور اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ جو خواتین حالات سے مجبور ہو کر اس میدان میں آجاتی ہیں انہیں خاصی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ جی حضوری کرنے والے کامیاب اور اپنا وقار

خالد حمید ارجمند شاہین محمد قوی خان ثریا شہاب

بحال رکھنے والے ناکام رہتے ہیں۔ یوں بھی کام کرنے والی عورت دو محاذوں سے لڑ رہی ہوتی ہے۔ دفتر کا ماحول حوصلہ افزا نہیں ہوتا۔ اور گھر والے بھی اس کی اضافی ذمہ داری سے تعاون نہیں کرتے۔ اسے عام عورت سے دوگنا کام کرنا پڑتا ہے۔ خاندان کے کفیل مرد کو جو اہمیت حاصل ہے وہ عورت کو نہیں ملتی۔ وہ تھکی ہاری آتی ہے۔ تو کوئی نہیں کہتا کہ اسے آرام کی بھی ضرورت ہے وہ گھر آتے ہی چولھے ہانڈی میں جت جاتی ہے۔ تب جا کر کھانا نصیب ہوتا ہے۔

* نظریات کے خلاف خبر پڑھنا کیسا لگتا ہے؟

* بہت تکلیف دہ۔ لیکن میں نے ہمیشہ خبر کو اس کے سیاق و سباق سمیت پوری دیانت داری سے پسند و ناپسند سے ہٹ کر خبر کے صحیح تناظر میں سامعین تک پہنچایا ہے۔ پروفیشن میں جذباتیت کی اہمیت نہیں ہونی چاہئے۔ اور ہمارے کام کی تو نوعیت ہی انتہائی حساس ہے۔ ذمہ داری کا تقاضہ ہے کہ اس میں خیانت نہ ہو۔

* کبھی سکرین پر آنے کو دل کرتا ہے؟ یعنی پی ٹی وی والے بلائیں تو آپ کا ردعمل کیا ہوگا؟

* بالکل نہیں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ میں اپنا وقت کامیابی کے ساتھ گزار چکی ہوں۔ اور نئے آنے والے باصلاحیت افراد کے لئے اچھے اور حوصلہ افزا حالات کی دعا کرتی ہوں۔

* نیوز ریڈرز میں آپ کا آئیڈیل کون ہے؟

* آپ کو حیرت ہوگی خبریں پڑھنے کا پیشہ اختیار کرنے سے پہلے میں نے کبھی خبریں نہیں سنیں تھیں۔ جو کسی کو آئیڈیل بناتی۔ ہاں روزانہ اخبار اپنے سسر کو پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔ اسی میں میری تربیت بھی ہو گئی اور تلفظ کی درستگی بھی۔ بعد میں وراثت مرزا مرحوم نے میری حوصلہ افزائی کی۔ ان کی شفقت مجھے حاصل رہی۔ مجھے بھی ان سے عقیدت رہی۔ ٹی وی پر کوئی نہیں۔

* اس شعبہ میں دلچسپی رکھنے والی خواتین کو کیا مشورے دینا پسند کریں گی؟

* ایک طالب علم کی حیثیت سے اس شعبے میں آئیں گے تو کچھ سیکھ سکیں گے ورنہ بیکار ہے۔ محنت کریں اپنے شعبے سے لگن برقرار رکھیں۔ پہلے سے موجود تجربہ کار لوگوں کی عزت کریں ان سے استفادہ کریں۔ مثل مشہور ہے۔ باادب بانصیب بے ادب بے نصیب

اندھیرے سویرے

آہ لالہ مالک رام

بھارت سے لالہ مالک رام کی رحلت کی خبر آئی ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی کے انتقال کے بعد لالہ مالک رام کی وفات سے دونوں ملکوں کے ثقافتی رابطے کا ایک اور ---- اور جہاں تک میں پاکستان کے علاقائی تناظر میں دیکھ سکتا ہوں ----- آخری پل بھی مسمار ہو گیا لالہ کی وفات سے اردو اور فارسی کی شاہراہ بھی سنسان ہو گئی۔ قناعت اور محنت ان کی زندگی کے دو رہنما اصول تھے۔ طرز زندگی کی اسی روشنی اور قوت سے وہ تنہا محض غالب اور اقبال پر اتنا عظیم' جاندار اور یادگار تحقیقی کام کر گیا کہ بڑے بڑے ادارے اتنی تلاش' خوبی اور ذمہ داری کے ساتھ نہ کر سکیں۔ ذاتی طور پر لالہ مالک سادگی اور انکسار کا پیکر تھے۔ مجھے دہلی میں بھی دو مرتبہ ان کے در دولت پر حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ لالہ مالک رام کی جنم بھومی پھالیہ (ضلع گجرات) پنجاب تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں پھالیے کا کوئی کسان اپنی "مل پنجابی" چھوڑ کر ----- کتابوں کی دنیا میں گم ہو گیا ہے۔ ----- اپنے کھیتوں کو پانی پلاتے پلاتے ----- علم کا سمندر پی گیا ہو۔ جتنی دیر ان کی خدمت میں حاضر رہا وہ پاکستان کے اہل قلم کی خیر و عافیت دریافت کرتے رہے --- پھالیے کی گلیوں اور کھیتوں کی باتیں کرتے رہے ----- غنیمت کنجاہی کے اشعار سناتے رہے۔ لالہ مالک رام دہلی میں ہمارے پھالیے کی پھلواری تھے۔ ان کی باتوں سے یوں لگتا جیسے وہ رہتے دہلی میں تھے مگر جیتے پھالیے میں تھے۔ (ضمیر)

ادیبوں اور شعراء سے ایک سوال

راولپنڈی کے ایک کالج کی متعلمہ نے "چہارسو" کے ذریعے ملک کے ادیبوں اور شاعروں سے اس صراحت کے ساتھ کہ جواب دس سطروں سے زائد نہ ہو یہ سوال پوچھا ہے کہ

"زندگی کیا ہے"

جوابات' جو یکم ستمبر تک ہمیں موصول ہوں گے ہم اس بچی تک پہنچا دیں گے۔ (مدیر)

پروفیسر پریشان خٹک پر کتاب

نامور ماہر تعلیم' ادیب اور دانشور پروفیسر پریشان کی شخصیت اور فن کے بارے میں حاجی گل بخشالوی کی مرتب کردہ بے حد خوبصورت کتاب "قلم قافلہ لکھاریاں" کے اہتمام سے شائع ہو کر منظر عام پر آ گئی ہے۔ ملک کے اہل قلم نے پاکستان کے اس نامور فرزند کو ان کی عظیم ملی وعلمی خدمات پر شایان شان ہدیہ ادارت پیش کیا ہے۔

سلیم احمد پر ڈاکٹریٹ

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور نے رحیم یار خان کالج کے پروفیسر عزمی کو سلیم احمد مرحوم پر ڈاکٹریٹ کرنے کی منظوری دی ہے۔ مقالے کے ایک ممتحن ڈاکٹر جمیل جالبی ہیں۔

الریاض میں نصیر احمد ناصر کی کتابوں کی رونمائی

معروف شاعر نصیر احمد ناصر کی دو کتابوں ------- "دسمبر اب مت آنا" ---- اور ----- "زرد پتوں کی شال" --- کی رونمائی کے لئے بین الاقوامی شہرت کے سائنس دان اور دانشور ڈاکٹر انور نسیم نے اپنے گھر پر ایک پر تکلف ضیافت کا اہتمام کیا۔ طعام کے بعد جناب شبنم مناروی' ڈاکٹر ستیہ پال آنند اور محترمہ عذرا نقوی نے نصیر ناصر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔

اُردو زبان کی چارسوسالہ تاریخ کا پہلا مبسوط جائزہ

اُردو اِصطلاحات سازی

از: ڈاکٹر عطش درانی

* اُردو تحقیق کا ایک اہم سنگِ میل جدید اصطلاحیات کا نقطۂ آغاز۔
* اُردو زبان کی ترقی کی کئی راہیں سجھانے اور نئے زاویے عطا کرنے والی کتاب۔
* ایک ایسا اچھوتا، انوکھا اور جدید موضوعِ تحقیق جس پر مصنف کو پنجاب یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔

صفحات: ۵۸۰ ، قیمت: ۱۶۰/- روپے

مصنف سے ملنے کا پتا: ۱۵، جی ۹/۱، اسلام آباد

رس رابطے *

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

ہم اسلام آباد سے دور ہوئے تو آپ اور بھی زیادہ یاد آنے لگے۔ حال میں ماہنامہ "قومی زبان" کے سرورق پر آپ کو دیکھا تو بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے ماہنامہ سنبھال کے رکھا ہے اور بڑی احتیاط سے سنبھال کے رکھا ہے کہ

روزِ محشر برکے در دست گرد نامہ را
من نیز حاضری شوم تصویرِ جاناں در بغل

"قومی" کام کے حوالے سے نتائج کچھ اچھے نہیں ہوئے لیکن "قومی زبان" کے ناطے سے یہ تصویر ماشاء اللہ بڑی اچھی نکل آئی ہے۔ ویسے ہم بھی تو منشیات سے ہی زندہ ہیں۔ امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہیں۔ اگرو صاحب کو سلام!

ڈاکٹر سلیم اختر

برادرم گلزار جاوید

تسلیم!

چہار سو باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ شکریہ۔ آپ نے یہ بہت اچھا کیا کہ زندہ اور اہم ادبی شخصیات پر خصوصی گوشے طبع کر رہے ہیں کبھی زمانہ میں "افکار" اور اب "طلوع افکار" بھی یہی کر رہے ہیں اپنی تو ادبی صورت حال ہمیشہ سے ایسی رہی ہے کہ بقول ندیم:

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

اعزاز کے ساتھ دفنانے کا مطلب ہے مرنے کے بعد ایک دلدوز خاکہ یا کالم۔ ایسے میں چہارسو کی یہ خدمات قابل ستائش ہے کہ زندوں کا حق زندگی ہی میں ادا کر کے بقیہ ادبی پرچوں کا فرض کفایہ بھی ادا کر رہا ہے راولپنڈی ہی میں ایسے منفرد اہل قلم موجود ہیں جنہیں میڈیا پر پروجیکشن نہیں ملی۔ اور وہ اس تنقیدی پذیرائی سے محروم رہے جو ان کا حق بنتی ہے۔

مختار زمن صاحب سے کراچی میں ایک دو ملاقاتیں ہوئی تھیں میں نے انہیں بہت دلچسپ شخصیت پایا اب ان کے کوائف اور ان کے بارے میں مضامین پڑھ کر ان سے گویا صحیح معنوں میں مفصل ملاقات ہو گئی۔

آپ نے کراچی ہی کے محترم لطف اللہ اور ان کی بیگم صاحبہ کے بارے میں جو لکھا اس سے طبیعت خوش ہو گئی میری ان سے پرانی نیاز مندی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کراچی جاؤں اور ان کے ہاں حاضری نہ دوں۔ انہوں نے جو صوتی لائبریری بنا رکھی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے کم از کم پاکستان اور ہندوستان میں تو اس پایہ کا ذخیرہ کہیں نہ ملے گا نہ ذاتی حیثیت میں اور نہ ہی سرکاری طور پر، حتیٰ کہ ریڈیو میں بھی نہیں جس کا کاروبار ہی آواز ہے۔

شبنم شکیل کے افسانے "لیکن نہیں خواہاں کوئی ------" نے عجیب خوشگوار حیرت دی کہ یہ خوش اسلوب شاعرہ ایسی اچھی کہانی بھی لکھ سکتی ہے ویسے میرا شبنم بی بی کو مشورہ ہے کہ افسانے نہ لکھے تاکہ "پڑوسن" کا رزق نہ مارا جائے۔

قبلہ جعفری صاحب سفرنامہ لکھ رہے ہیں اور اسے میموں کے بغیر دلچسپ بنا رہے ہیں کمال ہے! ویسے ایک لحاظ سے تو یہ اچھا ہی ہے کہ اگر کوئی ریٹائرڈ دوشیزہ یا ہم عمر میم مل جاتی تو جعفری صاحب اسے اپنی مزاحیہ شاعری سے تو خوش نہ کر سکتے!

ڈاکٹر وحید قریشی

برادرم گلزار جاوید

خط مل گیا۔ کرمفرمائی کے لئے ممنون ہوں۔ آپ میری کالم نویسی کے قائل ہو گئے میں آپ کی افسانہ نگاری کا پہلے سے قائل ہوں۔ یہ میری محرومی ہے کہ آپ آئے اور ملاقات نہ ہو سکی۔ بتا کر آیئے تو چشم براہ ہونگا۔

صبیح محسن (کراچی)

"چہارسو" کا تازہ شمارہ ملا۔ ڈائجسٹوں کے اس دور میں ایسا صاف ستھرا رسالہ نکالنا یقیناً ہمت والوں کا ہی کام ہے۔ خصوصاً "قرطاس اعزاز" کا سلسلہ تو بڑا ہی محنت طلب ہے۔ آپکا سفرنامہ بھی پڑھا۔ نثر میں بھی وہی شگفتگی پائی۔

آپ نے بھی فرمایا ہے اور خود بھی جی چاہتا ہے کہ "چہارسو" جیسے پرچے کے لئے کچھ لکھا جائے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جب سے اسٹیشن پر تعینات ہوئے ہیں فائلوں پر Note کے علاوہ کچھ اور لکھنے کا ہوش ہی نہیں ہے۔ بہرحال جب بھی توفیق ہوئی، ضرور آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔

حمیرا رحمٰن (نیو یارک)

محترم گلزار جاوید صاحب

چہار سو باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے اور آپکی انتھک کاوشوں سے اس کا معیار دن بدن بہتر ہو رہا ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد یہ چوٹی کے ادبی پرچوں میں شمار کیا جانے لگے گا۔ مجھے اپنی کاہلی پہ ندامت ہے جو کچھ میں اس کے لئے کرنا چاہتی ہوں نہیں کر سکی۔ بہرحال چند تخلیقات روانہ کر رہی ہوں۔ دوستوں میں بھی آہستہ آہستہ تعارف کا سلسلہ جاری ہے۔ چہار سو کا مختار زمن نمبران دنوں زیر مطالعہ ہے۔ اس میں کئی اچھی باتیں ہیں لیکن کتابت کا مسئلہ خاصی سنجیدگی سے نظر آ رہا ہے۔ کمپیوٹر کی کتابت میں آسانی تو بہت ہے لیکن یہ کبھی کبھی کھیل کر جاتی ہے۔ اس سلسلے میں خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

"بحر اوقیانوس کے اس پار" میں بڑی منفرد تفصیلات پہ ضمیر جعفری صاحب نے قلم اٹھایا ہے۔ شاید ہم امریکہ میں رہنے والے بھی اس قدر باریک نگاہی سے حالات کا معائنہ نہ کرتے ہوں۔ کیونکہ اس کے خاصی حد تک عادی ہو چکے ہیں۔ جعفری صاحب کے اس سفرنامے میں جہاں امریکی تہذیب اور معاشرے پر سے کئی نقابیں الٹتی ہیں وہاں کہیں کہیں آزادئی نسواں کے سلسلے میں ایک مشرقی مرد کے خیالات بھی بلند آواز سے سنائی دیتے ہیں۔

پروفیسر خالق طور (کمپالا یونیورسٹی افریقہ)

بفضل تعالیٰ آپ بخیریت ہوں گے۔ گوناں گوں مصروفیات اور بلا گزشتہ کسی شناسائی کے آپ نے مجھے وقت دیا۔ تہہ دل سے مشکور ہوں۔

"غائت تالیف" کے چند کاغذات چھوڑ آیا تھا مل چکے ہوں گے اور آپ نے جو کچھ رقم کیا ہوگا یورپی شاعری سے تقابل کے یہ چند صفحات ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ کا ادبی حلقہ اہمیت دے گا۔ کہ یہ منفرد نوعیت کا کام ہے۔

پرچہ "چہار سو" دیکھا ہے۔ اچھا خاصہ ادبی معیار لئے ہوئے ہے۔ تحریر بھی بوجھل نہیں۔ ہلکی ہلکی مزاح کی چاشنی ساتھ ساتھ ہے۔ آپ اس مجلّہ کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ یہ تو گھر آ کر ہی پڑھا گیا۔ اصل میں جس روز آپ سے ملنا ٹھہرا تھا بے دھیانی میں نظر کا چشمہ گھر بھول آیا۔ لہٰذا کچھ بھی پڑھنے سے قاصر تھا۔ بہرحال اردو ادب کے فروغ میں آپ کی خدمات قابل ستائش ہیں۔

جمشید مسرور (ناروے)

اسلام آباد میں آپ نے جتنی محبتیں نچھاور کیں ان کے لئے ممنون ہوں۔ آپ کے مضمون کی اشاعت کی اجازت چاہتا ہوں۔ جو آپ نے مجھے مرحمت فرمایا تھا۔ گلزار جاوید صاحب کی خدمت میں سلام۔

پروفیسر نظیر صدیقی

"چہار سو" کے دو شمارے (مارچ اور اپریل) ایک ساتھ ملے۔ آپ کی اس عنایت خاص کا بہترین شکریہ یوں ادا ہو سکتا تھا کہ میں "چہار سو" کے ہر شمارے میں کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا سو یہ کام موجودہ حالات میں ممکن نہیں ہو رہا ہے۔ آپ کا قرض میری گردن سے اترے تو کس طرح۔

"چہار سو" مائل بہ ترقی نظر آتا ہے۔ آپ کی ادارت میں اس طفل نوخیز کا جوان رعنا بن جانا ناگزیر ہے۔ چہار سو میں لکھنے کے لئے بار بار نیت باندھتا رہتا ہوں۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں اچھے کاموں کی نیت کے مقدر میں ٹوٹتے رہنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ کے قلمی معاون اور میرے ذاتی دوست نسیم احمد 20 جون کو داغ مفارقت دے گئے۔ اللہ مغفرت کرے۔

مختار زمن

مکرمی ---- گلزار جاوید

یہ شعر یاد آیا۔

اے مصور ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں
خوب تصویر بنائی مجھے دکھلانے کو

آپ کے بھیجے ہوئے پرچے اور تصاویر مل گئیں۔ آپ نے کمال کر دیا۔ معافی کیوں مانگتے ہیں؟ بہت اچھا پرچہ نکالا۔ وہ تمام پرچے آتے ہی دوستوں نے لے لئے۔ لہٰذا آپ کو ایک الگ چیک بھیجوں گا۔ آپ تقریباً 15 پرچے بچا کر رکھیئے گا۔ میں اس وقت ہانگ کانگ اور چین جا رہا ہوں۔ اسی لئے آپ کو ابھی چیک نہیں بھیج سکتا۔ گھر بند رہے گا اور کوئی بھی ڈاک وصول کرنے والا نہ ہوگا۔ پیر و مرشد کو میرا سلام و شکریہ۔ میں شفیق صاحب کو خط لکھوں گا لیکن آپ سے ملاقات ہو تو مری طرف سے ضرور بالضرور شکریہ ادا کر دیجئے گا۔ انہوں نے اس عاجز کے متعلق جو کچھ لکھا خوب لکھا مگر من انم کہ من دانم